بیان

(ناول)

مشرف عالم ذوقی

اس وقت جب تم اپنے گلاس میں اسکاچ انڈیلتے ہو،
کاکروچ مارتے ہو
یا اپنی گھڑی دیکھتے ہو
جب تم اپنی ٹائی درست کرتے ہو...... لوگ مررہے ہیں
مضحکہ خیز ناموں والے شہروں میں گولیوں سے چھلنی ہورہے ہیں
شعلوں میں جھلس رہے ہیں
اور زیادہ تر نہیں جانتے...... کہ لوگ کیوں مررہے ہیں
ان چھوٹی جگہوں پر جنہیں تم نہیں جانتے
لیکن وہ اتنی بڑی ہیں کہ انہیں چیخنے یا خدا حافظ کہنے کی
مہلت بھی نہیں دی جاتی
......لوگ مررہے ہیں
لوگ مررہے ہیں...... اس وقت جب تم تغافل اور ضبط نفس وغیرہ
کے نئے پیغمبروں کا انتخاب کررہے ہو......
لوگ مررہے ہیں
لوگ مر رہے ہیں......
(جوزف براڈسکی A Tune for Bosnia)

بیان

(بالمکند شرما جوشؔ مرنے سے پہلے بیان دینا چاہتے تھے)

مصنف:
مشرف عالم ذوقی

AALAMI MEDIA PVT. LTD.
1/1, kirti Apts, Mayur Vihar-I
Delhi-110091
Ph : 9717474307

کتاب	:	بیان
مصنف	:	مشرف عالم ذوقی
زیر اہتمام	:	اے۔رحمان (چیئرمین عالمی اردو ٹرسٹ)
اشاعت	:	2014
قیمت	:	تین سو روپے (بیرون ممالک:15$)
مطبع	:	نٹراج پرنٹرس، دریا گنج، نئی دہلی

Bayan

by:

Musharraf Alam Zauqui

E-mail : zauqui2005@gmail.com

چھ دسمبر......

......کے نام

اس ناول میں شائع تمام کرداروں کے نام، واقعات اور مقامات فرضی ہیں، کسی بھی طرح کی مطابقت کے لیے مصنف یا ناشر ذمہ دار نہیں ہوں گے۔

ورتمان

ڈراؤنا خواب

(۱)

بالمکند شرما جوش باہر نکلے تو آنکھیں انگاروں جیسی لال ہو رہی تھیں۔ سر چکرا رہا تھا۔ گرنے کو ہوئے تو دروازہ اپنے کمزور ہاتھوں سے پکڑنا چاہا، مگر جیسے اندر کی قوت ہی جواب دے گئی تھی......

یہ سب......؟

آنکھوں کے آگے جیسے ہزاروں وحشی، قبائلی تانڈو کر رہے تھے...... مار ڈالیں گے تمہیں مار ڈالیں گے......سب کو مار ڈالیں گے...... مارو......

آنکھوں کی تکلیف تھی یا جانے کیا تھا کہ سب کچھ دھواں دھواں سا دکھ رہا تھا۔ جیسے وحشی ہو رہی عوام پر، بے قابو ہوتی ریلی پر، پولیس آنسو گیس کا استعمال کرتی ہے......اسی طرح یہاں آنکھوں کے سامنے، سب کچھ اندھیرا اندھیرا سا ہے......سامنے والا آدمی بھی......بجلی کا کھمبا بھی...... یہ جہاں وہ کھڑے ہیں...... یہ دروازہ......سامنے کی کھڑکی...... وہ آنکھیں اٹھاتے ہیں......اور آسمان...... دھواں دھواں ہوتے ہوئے سرخی مائل...... جیسے بیمار آدمی کو چکر آتے ہیں، اور بے ہوش ہونے سے پہلے کی سیما ہوتی ہے......سب کچھ سرخی مائل......دھواں...... دھواں...... یہ سب......

وہ سڑک کو غور سے گھورتے ہیں......اتنی سنسان کیوں ہے؟ کوئی حادثہ ہو گیا ہے کیا......تمام دکانیں بند کیوں ہیں......اور یہ آسمان پر ہیلی کاپٹر کیوں ناچ رہے ہیں......

''جنگ ہوگی میاں، جنگ ہوگی......''

وہ سب کچھ بھول کر آنکھوں کے پردے اچانک نمودار ہوئے برکت بھائی کو دیکھتے ہیں......

پھر جیسے سارا منظر صاف ہے۔

برکت بھائی پان بہت کھاتے ہیں اور پان کھاتے ہوئے لحاظ نہیں رکھتے کہ پان کا تھوکا کہاں گرے گا۔ قمیص پر یا سفید دیوار پر، قمیض پر گرے تو چلو کوئی بات نہیں۔ گھر ہے، بچے ہیں، ڈرائی کلینرس کی دنیا بھر کی دکانیں ہیں۔ مگر دیواروں پر...... وہ بھی دوسروں کی دیواروں پر، دوسرا پتہ نہیں کیا سوچ لے......یہی تو اچھا لگتا ہے، بڑھاپے میں...... بوڑھا آدمی عام احساس سے کٹ جاتا ہے۔ عیب جوئی اور بری سوچوں سے، کوئی کیا کہے گا۔ کے کھٹکے سے......

آخ تھوہ......

پیک گھوٹتے نہیں......تھوک دیتے ہیں......گردن ہلاتے ہیں۔ آنکھوں پر چڑھا چشمہ ہلتا ہے......ہلتی ہیں ان کی ڈھیر ساری چہرے کی جھریاں...... ہونٹ کے باہر بن بلائے مہمان کی طرح ٹپک گئے پان کے تھوک کو آرام سے اپنے سفید ہاتھوں سے پونچھ کر قمیص میں مل لیتے

ہیں......

''جوش بھائی...... جنگ ہوگی...... دیکھ لینا جنگ ہوگی''

'تمہیں تو جب دیکھو، بس جنگ کی ہی سوجھتی ہے......'

'لو......'

برکت بھائی بچوں کی طرح انہیں دیکھ کر ہنستے ہیں......اور کیا رہ گیا ہے جوش بھائی! زندگی میں اب......بس جنگ ہی تو ہے...... بچے کام دھندے سے فارغ ہوکر آتے ہیں تو جنگ کی باتیں، ریڈیوں کو لگاؤ تو وہی چیختی چنگھاڑتی دل دہلا دینے والی خبریں، ٹی وی سنو تو وہی قصہ —— ایک ہم تو تھے، ہمارا بھی زمانہ تھا۔ جوان تھے تو جوانوں جیسی باتیں کرتے تھے یہ نہیں کہ جنگ کا قصہ ہے تو بس جنگ کا قصہ ہے۔ اور بن گئے بوڑھے۔ منہ لٹکا لیا جوانی میں پوپلے ہوگئے...... چہرے پر سنجیدگی چڑھا لی۔ نہ کھانے کی فکر نہ پینے کی۔ بس فکر ہے اور گھلے جا رہے ہیں۔'

'وقت ہی خراب ہے'

'نہیں، وقت کو گالی مت دو جوش بھائی! ہم ہی خراب ہوگئے ہیں، ہم ہی ایک دوسرے کے عیب ڈھونڈتے ہیں۔ سامنے سے آؤ تو گلے ملتے ہیں اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں۔ ایک دوسرے کو چھرا بھونکتے ہیں...... بدل گیا ہے جوش بھائی......سب کچھ بدل گیا ہے۔

بالمکند شرما جوش، برکت بھائی کی آنکھوں میں جھانکتے ہیں......مسکراتے ہیں۔

'سچ کہنا، تم بدل گئے ہو کیا؟'

'نہیں۔ لیکن میرے نہیں بدلنے سے کیا ہوتا ہے۔ بچے بدل گئے ہیں، زمانہ بدل گیا ہے۔ ہماری تمہاری باتوں پر چلنے والے اب کہاں رہ گئے ہیں۔ حکم دے کر تو دیکھو، بچے سن لیں تو سو احسان سمجھو، نہ سنیں تو خیر مناؤ کہ اتنا مان دے رہے ہیں تم کو کہ قدم قدم پر ذلیل نہیں کر رہے ہیں اور اپنے گھر میں رکھ رہے ہیں۔

وہ گلا کھکھارتے ہیں۔

'برکت بھائی! اتنا بھی برا دور نہیں ہے، تم حالات کو کچھ زیادہ ہی لے رہے ہو۔ اور سب کی تھالی ایک جیسی تو نہیں ہوتی اور اپنی تھالی سے جگ کی تھالی کا موازنہ تو نہیں کیا جا سکتا۔'

'لو......خوب نکالی تھالی کی مثال۔'

ہنستے ہیں برکت بھائی......ابھی اینٹھو مت زیادہ جوش بھائی...... وہ دن آئے گا۔ جب بازار میں مول کرنے جاؤ گے تو پوچھا جائے گا، کس کی تھالی چاہئے...... ہندو کی تھالی......یا مسلمان کی تھالی......'

●●

آنکھوں کے آگے جیسے میزائلیں چمکنے لگیں......راکٹ لانچرس چھوٹنے لگے...... یہ سڑک اتنی سنسان کیوں ہے...... کچھ ہوگیا ہے کیا...... یاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں جوش بھائی......سامنے کا پول......سڑک......اور آس پاس کی دکانیں......دھواں دھواں ہوتے ہوئے بھی سب ایک عجیب سے بھیانک خطرے والی سناٹگی کا احساس دلا رہے ہیں۔

صبح سے لگاتار آسمان پر ہیلی کاپٹرس چکر لگا رہے ہیں...... ویسے جیسے جنگ کے دنوں میں......ابھی زیادہ دن تو نہیں بیتے...... چاروں طرف سے جنگ کے سائرن بجتے سنائی دیتے تھے......آنکھیں خبروں پر ٹکی ہوتی تھیں......کان ریڈیو سے لگے ہوتے تھے......خدارا......اس بھیانک خواب کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ کب بند ہوگی یہ ہند و پاک کی جنگ —— جب ہیلی کاپٹر اڑتے تھے تو لگتا تھا ایک خوفناک چڑیا اپنے پروں کو پھیلائے اپنی چونچ میں کوئی خطرناک بم دبائے گھوم رہی ہے پورے وجود میں سنسنی چھائی ہوئی تھی۔ اور سائرن کی خوفناک آوازیں......لیکن تب تو جنگ کا سماں تھا...... پورے ماحول نے جنگ کے اثرات قبول کر لیے تھے......اور وہ صرف ایک ہی دعا کر رہے تھے، جنگ بند ہو......

دلوں کے اندیشے بادلوں کی طرح چھٹ جائیں......آنکھوں سے شک مٹ جائے......فاصلے پھر قربتوں کو چھولیں۔

تب سے آج تک زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا......مگر ماحول خراب ہی رہا...... ہند و پاک جنگ کی باتیں رہیں یا اپنی خانہ جنگی میں ملک جھولتا رہا...... یہ فساد رہے......دنگا رہا...... یا آنکھوں میں سانپ کی طرح بیٹھا شک رہا اور رہے وہی برکت میاں۔

رہے وہی بالمکند شرما جوش......

اور سب کچھ وہی رہا...... وہی پڑوس کے لونڈے لپاڑوں کی بھیڑ، مشاعرے کی محفل...... ہوٹنگ...... کمرے میں ٹہل ٹہل کر مصرعے موزوں کرنا...... ہر ماہ، ماہانہ نشست کا خیال کرتے ہوئے برجستہ اشعار کا لب پر آنا......گنگنانا......بچوں کا شک سے دیکھنا......

اکیلے، تنہا کمرے میں خود کی چٹکی لے رہے ہوتے بالمکند شرما جوش......میاں جوش...... کیا شاعری کرتے ہوتم...... ارے واہ...... واہ......بچوں کو چھوڑو......آج کے بچوں کی سمجھ ہی کتنی ہے......مشاعرے میں داد تو ملتی ہے نا......ارے چھوکرے ہوٹنگ کرتے ہیں تو کیا...... سب اپنے بچے ہیں جوش میاں...... داد دینے کے سب کے اپنے اپنے طریقے ہوتے ہیں...... پھر دیر تک کمرے میں لہک لہک کر شاعری ہوتی...... ریک سے نکال نکال کر غالب و اقبال کے دیوان الٹے پلٹے جا رہے ہوتے......اور کبھی کبھی تو مزے مزے کی بیوقوفیاں سرزد ہو جاتیں...... جیسے دیوان حافظ نکال کر، آنکھ بند کر کے شہادت کی انگلی کسی شعر پر رکھی جاتی، یہ دیکھنے کے لیے کہ مشاعرے میں غزل کی واہ واہی کی تعبیر نکلتی ہے یا نہیں......اور تعبیر جب سمجھ میں نہیں آتی تو گول گپا 'ہوپ' بن کر کمرے میں چپ چاپ بیٹھ جاتے جوش صاحب......

کوئی ملنے والا آتا تو پریشان ہو جاتا۔

''خدانخواستہ دشمنوں کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا جوش صاحب؟''

''ارے مارے دشمنوں کی طبیعت کو میاں، یہاں اپنی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔''

ملنے والا گھبرا جاتا......''کوئی خاص بات ہے کیا؟''

''اماں یار، شعر پر واہ واہی فال نہیں نکل رہی ہے۔ کب سے دیوان حافظ لیکر بیٹھا ہوا ہوں۔''

وہ خود بھی ہنستے اور ملنے والا تو اس بے ساختگی پر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتا......

آسمان پر کتنے ہیلی کاپٹر چکر لگا چکے ہیں......ایک......دو......تین......کئی کئی ہیلی کاپٹرس......ضرور بم برسائیں گے......ان کا بس چلے تو......زمین سے پتھر اٹھا اٹھا کر پتھراؤ کریں......کمبخت......دل دہلا دیتے ہیں یہ...... جانتے نہیں...... بوڑھے آدمیوں کا دل کتنا نازک ہوتا ہے......سینکڑوں طرح کی، دل کی بیماریاں ہوتی ہیں......

وہ ٹھہرتے ہیں......دھواں دھواں سرخی مائل مناظر، اب پولس کے سائرن میں بدل جاتے ہیں......سامنے سے ایک دو نہیں...... چار پانچ پولس کی جیپ تیز ہارن بجاتی ہوئی گزر گئی ہے......جیسے بھونچال سا آ گیا ہے......میاں جوش کہاں جا رہے ہو......سڑکوں پر اب آدمی نہیں چلتے، پولس چلتی ہے، گولیاں چلتی ہیں......میزائلیں چھوٹتی ہیں......بم کے گولے چھوٹتے ہیں......کلاشنکوف اور نئے نئے ماڈل کے جدید اسلحے شور کرتے ہیں......وہ وقت دور نہیں جب ہم تم سب صرف گھروں میں بند رہیں گے......وہ بھی اگر بچ گئے تو...... بم سے، آسمانی آفت سے، عذاب سے......اور پولس کی گولیوں سے......

''یہ کہاں جا رہے ہیں آپ؟''

دروازے پر نریندر کھڑا ہے۔

''ہاں......کہاں جا رہا ہوں......'' وہ جیسے خود سے بڑبڑائے......

''پتا جی...... یہ سمے تو گھر پر بیٹھ کر رام نام جپنے کا ہے......اور آپ......''

وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا قریب میں کھڑا ہو جاتا ہے...... ہاتھ تھامتا ہے...... ''چلیے میرے ساتھ......''

وہ جیسے خواب سے چونکتے ہیں......اپنا لڑکھڑاتا جسم نریندر کے حوالے کردیتے ہیں......

''چلو...... جہاں چاہے لے چلو......اب ان میں جان ہی کتنی بچی ہے......''

سیڑھیوں تک آکر ٹھہر گئے بالمکند شرما جوش۔ نریندر پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

''نریندر......اب چھوڑ دو۔''

''چلیے نا بابو جی......آپ کو اوپر کمرے تک چھوڑ دوں؟''

''نہیں۔''

وہ ایک پھیکی سی ہنسی ہنسے

''ضدمت کیجئے۔ آپ میں کمزوری آگئی ہے۔''

''ہاں بہت کمزور ہو گیا ہوں۔''

انہیں اپنی ہی آواز جیسے کسی تنگ و تاریک گہرے کنویں سے آتی معلوم ہوئی۔

''مگر نریندر تم جاؤ، آرام کرو، مجھے چھوڑ دو۔''

نریندر سامنے آ گیا۔

''آپ غلط سمجھتے ہیں ہمیں۔''

انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی......

''آپ ہمیشہ ہی غلط سمجھتے آئے ہیں......''

انہیں اپنی مسکراہٹ کسی بری خبر کی طرح ٹوٹتی ہوئی لگی......

نریندر کی آواز بھرا گئی——

''ضدمت کیجئے۔ اوپر چھوڑ دیتا ہوں۔''

اس نے ہاتھ پکڑ لیا......وہ دھیرے دھیرے سیڑھیوں کی بانہہ پکڑے اور نریندر کا ہاتھ تھامے اوپر بڑھتے رہے......کیا سچ مچ اتنے کمزور ہو گئے ہیں وہ اتنے کمزور کہ بغیر سہارے کے......انہیں حیرت تھی......لیکن اچانک......ایک دم اچانک......ابھی کچھ روز پہلے تک تو......ایسا کچھ بھی نہ تھا...... ہٹے کٹے تھے وہ......کسی کے محتاج نہیں......جی چاہا تو خود چائے بھی گرم کر لی......کون بہوؤں کو آواز لگانے جائے......مگر اتنی نقاہت......اس قدر کمزوری......

کمرے میں داخل ہوئے تو جیسے دھول کا ایک طوفان سا باہر نکلتا دکھائی دیا۔

ان کا پورا چہرہ لت پت تھا......کس سے؟ دھول سے......لیکن دھول کہاں تھی......

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟'' نریندر نے ٹوکا۔

''وہ......دھول''......

''دھول......''

نریندر نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا......''کیسی باتیں کر رہے ہیں باؤ جی......دھول کہاں ہے......اوما تو دس بار آکر پوچھا لگاتی ہے...... خود سے۔ میں نے ہی کہہ رکھا ہے......باؤ جی کا کمرہ گندہ نہیں رہنا چاہئے۔ آئی تھی نا اوما؟''

نریندر نے آنکھوں میں جھانکا......

''آئی ہوگی——میں نے دیکھا نہیں——''

''اپنی ہی آواز نہیں پہچان پائے جوش صاحب''

نریندر کو باؤ جی کی بات بری لگی......

''آپ تو پڑھتے لکھتے رہتے ہیں......اپنے ہی میں مگن رہتے ہیں۔آپ کو تو گھر کے بارے میں بھی کچھ پتہ نہیں رہتا......جیسے یہ کہ......''

اس شکوہ کے انداز میں کہا۔''آج مالو کا جنم دن تھا۔''

''مالو کا......؟''انہوں نے گلہ کھکھارا......

''ہاں مالو کا......صبح سے چیخ رہی تھی......دڈو کو مٹھائی کھلاؤ......ددو کو مٹھائی کھلاؤ......ددو بھی ہمیں انعام دیں گے......''

''میری طرف سے انعام دینا۔''جیب میں ہاتھ ڈال کر انہوں نے پچاس کا ایک مڑا تڑا نوٹ نکالا۔نریندر کے ہاتھو میں پھنسایا۔زور دیا......''میری طرف سے۔''

نریندر کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔''آپ دیتے تو کتنی خوش ہو جاتی......اوپر تو ڈر سے نہیں آتی۔میں نے ہی منع کر رکھا ہے......ددو کی کتابیں پڑی ہوتی ہیں......بچوں کی عادت تو آپ جانتے ہی ہیں......کمرے میں آئے گی تو چھوئے گی چھائے گی......روکنے سے تھوڑے مانے گی— آپ کا کیک بھی رکھا ہے۔بھجواؤں......؟''

''خواہش نہیں ہے......''

بے دلی جیسے ایک بار پھر ان پر چھاتی چلی گئی۔

نریندر پھر بوجھل ہو گیا۔

''آپ کو تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا باؤ جی......ہم ہی ہیں جو گھسے رہتے ہیں......آپ کو تو ہم سے بات چیت کرنا تک پسند نہیں۔ہم کوئی دشمن نہیں ہیں،آپ کے......''

''میں ہی دشمن ہوں اپنا— بوڑھا جیسے اپنی ہی ناراضگی کی سولی پر چڑھ گیا...... میں ہی پاگل ہوں...... پاگل ہوں تو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔کیوں آتے ہو بار بار میرے پاس......میرے پاس دھرا کیا ہے۔''

''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے......آرام کیجئے آپ......''

نریندر تیزی سے لوٹ گیا......

وہ پیچھے مڑے،واپسی قدموں کو دیکھتے دیکھتے پتھرا گئے۔کتنی جلدی وہ قدموں کو باہر لے گیا تھا۔اندر کی نرم انداز ہی رہ گئی......سامنے آتے آتے ایک باپ کی آواز اندر ہی اندر مر گئی یا کھو گئی...... وہ روکنا چاہتے تھے......نہیں روک سکے وہ میٹھی بانی بولنا چاہتے تھے نہیں بول سکے......آخر ایسا کیو ہوتا ہے......

ہمیشہ......

بچے آتے ہیں،سنگ چاہتے ہیں مگر حاوی ہو جاتا ہے،ان کے اندر کا سنکی بوڑھا ناراض کر دیتا ہے انہیں۔بچے بھی کیا کیا سوچتے ہوں گی......مگر نہیں......وہ چاہتے ہیں سب جیسا سب باپ سوچتے ہیں اپنے بچوں کو لے کر۔اپنے بچوں کے بارے میں۔ان کے مستقبل کی فکر کو لے کر۔

نریندر غصے میں چلا گیا۔

بالمکند شرما جوش نے اٹھنا چاہا......مگر اندر تک پھر ایک ٹھنڈی لہر اترتی چلی گئی......نہیں جائیں گے...... بچے کون سا خیال رکھتے ہیں ان کا......

لیکن مالو کا جنم دن ہے......مالو کتنا مانتی ہے۔ہر سمے ددو......ددو کہہ کر مچلتی رہتی ہے......اور مالو کے بجھول...... مالو کے سوالات......

''ددو آسمان میں اتنے تارے کہاں سے نکل آتے ہیں......چاند صبح میں کہاں چلا جاتا ہے ددو...... ہمارے اسکول کا مالی بتاتا ہے کہ سورج کا ایک بڑا سا گھر ہے......جیسے ہم اسکول سے چھٹی پا کر گھر چلے جاتے ہیں،ویسے ہی سورج بھی شام کو اپنے گھر چلا جاتا ہے......اور

ددو......

بالمکند جوش نے یاد کیا......اور منہ کا مزہ کڑوی کسیلی گولیوں کی طرح تلخ ہو گیا۔

اس دن ایسے ہی مالو بے مطلب کے سوال کئے جا رہی تھی......سوال کرتے کرتے ٹھہر گئی......

''ایک بات پوچھوں ددو......''

پہلے اس نے دھیان نہیں دیا۔

مالو پھر مسکرائی۔''ایک بات پوچھوں ددو۔''

''پوچھو۔''

آپ مسلمان ہیں کیا؟''

کتاب پڑھتے پڑھتے وہ ایسے چونکے جیسے کسی نے انجانے طور پر عقب سے حملہ کر دیا ہو......

وہ غصے میں گھوم گئے —

''کیوں؟''

''بس ایسے ہی۔''

انہوں نے کتاب سامنے رکھ دی......دونوں ہاتھ سے مالو کو تھام لیا۔''بتاؤ تم نے یہ سوال کیوں پوچھا؟''

''بس ایسے ہی۔'' مالو ڈر گئی۔

''نہیں، ایسے ہی نہیں۔''

انہوں نے چھوٹی سی مالو کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

''آپ اردو جو پڑھتے ہیں۔''

مالو معصومیت سے بولی انہوں نے گھبرا کر مالو کو چھوڑ دیا۔ ہکا بکا اسے دیکھتے رہے۔ پھر زور زور سے ہنس پڑے۔......

''ٹھیک کہتی ہے رے......مسلمان ہوں......مسلمان کیسے ہوتے ہیں؟''

''ایک دم سے گندے۔''

ددو کھلے تو مالو ڈر بھول کر معصومیت کی رو میں بہتی چلی گئی۔

''برے کیسے ہیں؟''

''وہ نہاتے نہیں ہیں نا، ماں کہتی ہے۔ ان کے پڑوس میں ایک ولی بھائی رہتے تھے، وہ جاڑے میں مہینوں نہیں نہاتے تھے، گرمی میں بھی جب تک ان کے کپڑوں سے اور بدن سے بدبو نہیں اٹھنے لگتی تھی، نہاتے نہیں تھے۔ نہیں نہاتے تھے۔ تب گندے ہوئے نا......''

''اور کیسے گندے ہیں؟''

''وہ گھر کو گندہ رکھتے ہیں......جانوروں کو مارتے ہیں اور......''

''اور کیا؟''

''وہ بدمعاش ہوتے ہیں۔ ذرا سی بات میں قتل کرنے سے نہیں چوکتے۔ جہاں زیادہ ہوتے ہیں، وہاں جانے کا نہیں ہوتا۔ نہیں تو تلوار دکھا کر بولتے ہیں، مسلمان بن جاؤ۔''

''اچھا...... یہ سب کہاں سے سیکھا۔''

''سیکھا کہاں سے۔ ڈیڈی بتاتے ہیں۔ کبھی کبھی ماں بولتی ہے، وہی سنتی ہوں ہوتے ہیں نا خراب؟''

مالو پیار سے، معصومیت سے ان کی طرف دیکھتی ہے۔

بس، جیسے انتہا ہو جاتی ہے......خود کو روکتے روکتے اندر سے غصہ ور بوڑھا غرانے لگتا ہے......

''بھاگ اپنے کمرے میں۔اب آئی تو ٹانگ توڑ دوں گا۔''

وہ غصے میں مُکّا نچاتے ہیں۔

مالو سسکیوں میں روتی ہوئی دروازے پر ٹھہرتی ہے......

''تم بہت برے ہو ددو۔ بہت برے پہلے تو میٹھی میٹھی باتیں کر کے خود ہی روکتے ہو...... پھر ہاتھ اٹھاتے ہو......ٹھینگا نہیں آتی تمہاری پاس......''

وہ روتی سسکتی ہوئی ٹھینگا دکھا کر کمرے سے بھاگ جاتی ہے......

بالمکند شرما جوش جیسے خواب وخیال کی دنیا سے اوندھے منہ گر کر واپس اپنی دنیا میں آجاتے ہیں...... کمرے میں اپنی میز پر نسوار تلاش کرتے ہیں......نسوار کی ڈبیہ ملتی ہے تو ناک میں گھسیڑتے ہیں......ایک ہلکی چھینک مارتے ہیں۔اور اپنی دنیا کا تنہا باوا آدم بن جاتے ہیں......

مالو کا جنم دن ہے......اور کمزوری ان کے پورے وجود پر غالب......نریندر کہہ گیا ہے...... کیک رکھا ہے مالو نے ان کے لیے......

اچانک جیسے پوری نقاہت اڑن چھو......سب جیسے دماغی تھکن ٹھہری......ایک منٹ میں ٹھیک...... بچی ہے...... جو بڑے سکھائیں گے وہی تو سیکھے گی......اس کی غلطی ہی کیا ہے...... بے چاری......

مالو......رے مالو......

اوپر سے آواز لگاتے ہیں......آواز گھڑ گھڑاتی ہے...... مالو......رے...... مالو......

اب جیسے اندر کوئی چھوٹا سا بچہ اتر رہا ہے...... بچہ شرارت کرنے کو بے چین...... مالو کو دیکھنے کو بے تاب......

مالو......رے مالو......

وہ سیڑھیاں اترتے ہیں......کہیں سے نقاہت نہیں...... ہاں، جیسے تھک گئے ہیں۔کافی مسلسل چلتے رہنے کے عمل کے بعد۔بس......

اب نریندر کے کمرے میں ہیں وہ......

اوما مالو کے ساتھ بیڈ پر لیٹی ہے۔ مالو ددو کی آواز سن کر بستر سے کودتی ہے۔اوما آنچل برابر کرتی ہے......آکر پیر چھوتی ہے......

''آپ نیچے کیوں آگئے باؤجی...... بلا لیتے۔''

''ارے اس کا جنم دن تھا۔''

چہکتا ہوا نریندر کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

''بابوجی کو کیک کھلاؤ مالو......''

''ابھی آئی۔''

مالو بھاگ کر فرج کھول کر کیک لے آئی۔

''اتنا بڑا نہیں رے۔''انہوں نے ایک چھوٹا پیس اٹھایا۔گود میں بھرنا چاہا......بستر پر بیٹھ گئے۔

''جیتی رہ......آباد رہ...... پڑھ لکھ کر......'' وہ تھوڑا ٹھہرے...... جیسے نریندر سے آنکھیں چرا رہے ہیں۔''پڑھ لکھ کر سچ مچ کا پڑھا لکھا بن، پڑھ کر جاہل مت بننا۔''

''میرے پیسے ددو۔''

''وہ نریندر کو دے دیا ہے۔''

''کتے۔''

''پورے پچاس روپے ہیں۔ تیری مٹھائی کے۔''

''ددوزندہ باد۔''

مالوخوشی سے اچھلتی ہے......

وہ جانا چاہتے ہیں تواومارو ک لیتی ہے۔

''باؤجی۔ چائے پی کر تو جایئے۔''

''نہیں......اچھا نہیں۔'' وہ زبردستی مسکراہٹ پیدا کرتے ہیں...... کیک کھالیانا'' جیتی رہو بہو۔''

اوما پوچھتی ہے۔'' پان بھجوادوں؟''

''نہیں۔ ابھی ہے۔ ضرورت پڑی تو پکارلوں گا۔''

نریندراوما سے کہتا ہے' خود ہی بنا کر باؤجی کے پن ڈبے میں رکھ دیا کرنا۔ ان کے پکارنے پر مت رہنا......'

●●

کمرے میں آنے پر لگتا ہے کیا سچ مچ ان کے آنے سے سب خوش ہو جاتے ہیں...... یا کوئی ناٹک ہے......سب ناٹک میں مصروف...... مگر ناٹک کیوں ہونے لگا۔ پوری زندگی کوئی ناٹک تو نہیں کرسکتا...... پھر......سب ایسے بجھ جاتے ہیں کہ...... وہ کبھی کبھی شرمندہ ہو جاتے ہیں......مگر ان کی خفگی، ناراضگی......''

سب نے اپنی اپنی دنیا بنا رکھی ہے......اپنی دنیا جہاں سانپ پھپھکارتے ہیں...... جہاں گرگٹ ناچتے ہیں...... جہاں زخمی نیولے گھومتے ہیں...... جہاں چاروں طرف زہریلے بچھو ہیں......

یہی دنیائیں ہیں، ان کی......مختصر سی دنیا......

بس انہیں اسی دنیا سے نفرت ہے......

دروازہ کھلا ہے—یہ باہر کا مردانہ بیٹھکا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہ تڑ......تڑاک اندر داخل ہو جائیں بالمکند شرما جوش...... آداب اور اخلاق کی موٹی موٹی، وزنی وزنی کتابیں جو بچپن سے تربیت کی نرم نرم پیٹھ پر باندھ دی گئی تھیں۔ وہ......؟

یہ نئے بچے تربیت کا پاٹھ کیا جانیں۔ آداب اور اخلاق کیا سمجھیں...... یہ نئے زمانے کے بچے ہیں...... نئے زمانے کے......

چودھری برکت حسین......

دروازے پر ٹھہر کر آواز لگاتے ہیں۔ بالمکند شرما جوش......'' بھائی چودھری برکت حسین تشریف رکھتے ہیں؟''

اب وہ زمانہ کہاں...... نہ گھوڑے رہے نہ گھوڑے پالنے والنے والے...... یہ سب خاندانی لوگ ہیں...... لیکن اب وہ خاندانی لوگ رہے کہاں......سب زرداروں کی قبیل کے ہیں تجارتی زبان سیکھ گئے۔ تجارتی زبان— کل کے تاجر بھی آداب اور اخلاق کا سبق سیکھے ہوئے تھے۔ زمانہ کتنا بدل گیا—بدلے ہوئے زمانہ سے نالاں ہوتے ہیں جوش صاحب......

دروازے کے بعد صحن ہے۔ صحن کے دائیں جانب تھوڑی سی پھلواری۔ پھلواری کے ادھر والے حصے میں بھی پہلے پھلواری ہی تھی......اس طرح کہ اندر داخل ہوئیے تو بیچ کے دونوں طرف اودے اودے— کھلے ہوئے گلاب اور دیگر رنگ، برنگے پھول آپ کا استقبال کریں گے۔ مگر برا ہو زمانے کا۔ بچوں نے اپنے اپنے وقت کے سبق پڑھ لیے۔ اتنی زمین فالتو کیوں جائے۔ سو بائیں طرف والی زمین کی پھلواری ختم کردی گئی۔ اور یہاں سے دو دکانیں نکال دی گئیں۔ دکانوں میں کرائے دار آ گئے۔ چودھری برکت حسین خفا تو ہوئے۔ تھوڑے دنوں تک ناراض بھی رہے، پھر وقت کی آواز سن کر چپ ہو گئے۔ یہی ان کی مرضی۔

''خوشبو کے کیا کرنے ہیں ابا۔''
سب سے پہلے تنویر نے یہ آواز اٹھائی تھی۔ ان کا لڑکا وہ یوں بھی اس ٹوٹتی، اجڑتی جاگیر کو لے کر نالاں رہتا تھا۔
تنویر کے بگڑنے کی صدا برکت بھائی نے جوش صاحب تک پہنچائی تھی...... ''لو......منا کی سنو...... کہتا ہے......خوشبو سونگھنے سے اللہ میاں پیسے تھوڑے ہی برسا دیں گے......ارے پریکٹیکل بنیے ابا میاں پریکٹیکل سب سے ضروری چیز آج کے زمانے میں پیسے کمانا ہے......''
''سو وہ تو ہے''
بالمکند جوش صاحب نے ٹھنڈا سانس بھرا......
وہ جیسے اپنی دنیا میں لوٹ آئے۔ اندر سے اب تک کوئی نہیں آیا تھا......
''ارے بھائی چودھری برکت حسین تشریف رکھتے ہیں۔''
''کون۔''
اندر سے غنودگی بھری آواز سنائی دی......آنکھیں ملتے برکت حسین باہر آئے۔ جوش صاحب کو دیکھا، بانہیں پھیلائیں۔ مسکراتے ہوئے اندر لائے۔
''زمانہ بدلا، تم نہیں بدلے جوش صاحب۔ ارے یہ تو مردانہ ڈیرا ہے۔ مردانہ۔ اس میں آنے میں کاہے کا شرمانا۔''
''نہیں بھائی۔ تم تو جانتے ہو۔''
''ایک بات کہوں۔''
''یہاں کہنے سننے کو ہی تو اکٹھا ہوئے ہیں ہم۔''
''کبھی کبھی لگتا ہے میاں...... کیا ہم اور ہمارے بچوں کے درمیان سینکڑوں برسوں کا فاصلہ ہے کیا۔ سوچو اس پر۔ لگتا ہے نا۔ سینکڑوں کروڑوں برسوں کا فاصلہ ہم اب گدھے معلوم ہوتے ہیں ان کے سامنے گدھے......''
برکت حسین ہنستے ہیں۔
بالمکند شرما جوش ہنس نہیں پاتے۔ اداس ہو جاتے ہیں۔
''بچوں اور ہماری بولیوں میں زمین آسمان کا فرق، ان کی ہماری تہذیب میں زمین آسمان کا فرق ہے......ان کے ہمارے خیالات میں زمین آسمان کا فرق اور......''
''ان کی ہماری تعلیم میں......'' جوش صاحب جیب سے پن ڈبہ نکالتے ہیں۔
برکت حسین گاؤ تکیے کے پاس سے ہاتھ بڑھا کر چوکی کے نیچے سے چمچاتا اگل دان نکال کر بڑھاتے ہیں۔
جوش مذاق کرتے ہیں۔
''آج اگل دان سے کشتی لڑی ہے کیا۔''
''یہی سمجھ لو— مگر میاں جھوٹ بولوں تو زبان سیاہ پڑ جائے۔ اب یہ مت سمجھنا کہ یہ گھر کے نوکروں کی صفائی ہے...... یہ میرے ہاتھ ہیں میاں میرے ہاتھ......''
''کاش......یہی کچھ سیکھا ہوتا زندگی میں۔''
جوش ہنستے ہیں......ڈرائی کلینرس میں نوکری تو مل گئی ہوتی......اور میاں ڈرائی کلینرس کی بھی بات جانیں آج کے لڑکے...... ہمارے وقت میں تو بس لے دے کر خاندانی دھوبی ہوتے تھے......ادھر کپڑا لیا۔ دوسرے دن سج سجا کر حاضر۔ گھر میں داخل ہوئے تو باہر ہی چپل اتار دیئے...... جب تک کپڑے لکھواتے رہے نظریں نیچی رہیں۔ کپڑے لکھوا دئے تب بھی مؤدب ہو کر کہتے...... گن لے جیو جی......اتنے کپڑے ہیں۔ اب وہ زمانہ کہاں......وہ خاندانی دھوبی بھی نہیں رہے۔''

''چھوڑو۔شطرنج نکالو......''

برکت حسین شطرنج نکالتے ہیں،مہرے پھیلاتے ہیں مہرے سجاتے ہوئے بھی بولتے رہتے ہیں......

''لو......اب یہ بھی سنو،بچو کو ہمارا شطرنج کھیلنا بھی ناگوار لگتا ہے......زیادہ دیر تک بیٹھ جاؤ تو ٹوکنے لگیں گے...... یہ کیا ابا کہ سارا دن بس شطرنج لے کر بیٹھ گئے......اسی میں تو تباہ ہوئے مسلمان۔''

''چودھری برکت حسین،تم سے کچھ الگ نہیں ہیں ہمارے بچے،ہمارے بچے بھی کچھ ایسا ہی سوچتے ہیں...... پیادہ چلو۔''

بالمکند شرما جوش کی آنکھیں بساط پر پھیل جاتی ہیں......

''یہ فیل چلا......''

چودھری برکت حسین نے پان چبایا۔تھوک کو مسکراتے ہوئے دیوار پر پھینکا۔سفید دیوار جا بجا پان کی پیک کی نقاشی سے چھن چھن کر رہی تھی......

''لو میاں......وزیر،بچو''

''وزیر تو سلامت رہے گا میاں......تم شہہ بچاؤ۔''

بالمکند شرما جوش ہنسے......

''چائے منگواؤں؟''برکت حسین نے پوچھا۔

''رہنے دو۔''

''رہنے دوں۔؟''

''ہاں۔اب چائے بھی مہنگی ہو گئی ہے۔''

''قیمت بڑھ گئی ہے۔''

برکت حسین نے اگالدان رہتے ہوئے پھر دیوار کی طرف تھوک اچھالا۔

''نہیں میاں دلوں سے ہماری عزت اتر گئی ہے۔مشکل ہو گیا ہے چائے بنانا۔اب سوچنا پڑتا ہے آواز لگاؤں یا نہیں —— بچے برا تو نہیں مانیں گے کہ بڑھو خود کھیلتے رہیں گے اور چائے کے لیے پریشان ہمیں کریں گے۔''

''آخر اتنا کچھ —— ہمارے اور ہمارے بچوں میں یہ زمین و آسمان کی کشتیوں میں تیرتی اپلاتی ہیں۔ہونٹوں پر لگے تھوک کو ہاتھ سے پونچھتے ہیں برکت حسین......''

بساط سے اٹھ کر آنکھیں،ایک دوسرے کی آنکھوں کی کشتیوں میں تیرتی اپلاتی ہیں۔ہونٹوں پر لگے تھوک کو ہاتھ سے پونچھتے ہیں برکت حسین......منہ ہلاتے ہیں—— ہلتی ہیں جھریاں بھی...... دھیرے دھیرے مسکراتے ہیں۔لیکن اس مسکراہٹ میں ایک عجیب سی سنجیدگی بھی شامل ہے......

''سب سنسکار کا فرق ہے......ہم تھے تو سنسکار بھی تھے......اور جب سنسکار سیکھتے تھے تو اونچ نیچ بھی سیکھتے تھے......ادب اور تہذیب بھی سیکھتے تھے۔نئے بچے اڑن کھٹولے پر سوار ہیں،نئی نئی چیزیں......ریڈیو وغیرہ تو پرانے پڑ گئے میاں......اب کیبل ہے،اسٹار ہے......زی،ٹی وی ہے......اے ٹی ان ہے......ہم تو بس بچوں سے سنتے رہتے ہیں...... پاپ میوزک ہے......تم ہی کہو بالمکند،کل کو ہم گھر میں ذرا زور سے بول سکتے تھے چیخ سکتے تھے،تہذیب کو بالائے طاق رکھ سکتے تھے......تمہیں ایک واقعہ سناؤں......ایک بار چھوٹا تھا۔چھوٹا کیا عمر ہو گی سترہ اٹھارہ کی......آج کے بچے تو اس عمر میں الف سے ی تک سب سیکھ جاتے ہیں۔کیا انہیں جانتے۔اور ہم......گبدو رہتے تھے...... بدھو...... بے وقوف......ہم صرف پڑھنا جانتے تھے۔نماز کا وقت ہو گیا تو وضو بناؤ۔نماز میں دیر نہیں ہو۔پڑھنے کا وقت ہوا تو پڑھنے بیٹھ جاؤ۔ہر کام اصول سے ذمہ داری سے......سترہ سال کی عمر کم نہیں ہوتی بالمکند۔ابا نے بلایا تو سہمے سہمے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے......جی ابا جان......

''ہوں، ابا نے ہماری طرف دیکھا۔ اسکول پڑھائی کی خیر خبر دریافت کی۔ پھر پوچھا...... میاں برکت۔ ذرا وہ اشرف میاں کی دکان سے خرچے کی چیزیں لے آؤ گے۔

ہم تو نہال ہوا ٹھے بالمکند میاں...... سترہ کی عمر ہو گئی تھی مگر بازار کیسا، سڑک کیسی بہت ہوا تو گھر سے اسکول۔ اسکول سے گھر۔ ابا کی بات سنی تو خوشی سے جھوم گئے ابا نے کسی قابل تو سمجھا۔ خوشی سے بولے۔ لائیے ابا جان۔ حکم سر آنکھوں پر ابھی لاتے ہیں۔ اور جانتے ہو پھر کیا ہوا۔ ابا جان غرائے۔ ایک ہاتھ پیٹھ پر دیا۔

چودھری برکت حسین پیٹھ کا درد محسوس کرتے ہیں۔ بالمکند جوش میاں...... اب بھی احساس کرتا ہوں تو وہ درد اپنی جگہ موجود ہے...... ابا غصائے تھے...... میاں میں نے تو محض تمہارا امتحان لیا تھا اور تمہاری مجال اتنی بڑھ گئی کہ باپ کے سامنے دکان جا کر سامان لانے کی باتیں کر رہے ہو...... نالائق...... نا ہنجار...... ناخلف......'

چودھری برکت حسین نے ٹھہاکا لگایا...... لو...... کیا زمانہ تھا میاں جوش۔ اب سوچو تو سینکڑوں برسوں کے فاصلے لگتے ہیں۔ لگتا ہے ست یگ کی باتیں ہیں...... آج کے بچے تو شیر ہیں...... کچھ بھی کرلیں۔ آپ باپ ہیں مگر بول نہیں سکتے...... سب سنسکار کی باتیں ہیں۔

''اب سنسکار رہی نہیں رہے۔''

بالمکند نے تھکی سانسیں چھوڑیں۔ آنکھیں شطرنج پر گڑائے ہوئے۔ پیادہ ہاتھ میں لیے بڑبڑائے اب سنسکار ہی اٹھ گئے...... اونچ نیچ...... چھوٹے بڑے کا لحاظ سب اٹھ گیا۔

اچانک مسکرائے...... زور سے آواز لگائی...... چودھری برکت حسین...... شہہ بچو۔

چودھری برکت حسین کے چہرے پر تناؤ کا جال پھیل گیا......

''لو پھنس گیا۔ تم نے باتوں میں الجھا کر آخر مات دے ہی دی...... اب شہہ کہاں بچوں...... چاروں طرف سے شہہ کو تمہارے پیادوں نے گھیر رکھا ہے...... اب مات ہی مات ہے ہمارے لیے۔''

ہاتھوں سے پیادے گرا دیئے۔ آواز لرز گئی۔

'تم کیا ہراؤ گے میاں۔ اب تو ہم لگاتار ہار رہے ہیں...... ہر محاذ پر...... ہمارے لیے ہار ہی ہار لکھا ہے۔

انہوں نے کسی کو آواز دی تھی...... شاید چائے کے لیے۔

(۳)

رات ہو گئی —

رات ہی سے تو نفرت ہے بالکمند شرما جوش کو...... رات، بھیانک رات...... ہر رات بھیانک ہوتی ہے...... آنکھیں بند ہوتی ہیں...... اور ایک جسم شتھل لاچار سا بستر پر پڑا ہوتا ہے...... کچھ کچھ مردہ سا...... دنیا و مافیہا سے بے خبر...... ممکن ہے تب خراٹے بھی بجتے ہوں...... یا چلتی ہوں سانسیں...... نتھنوں سے آواز اٹھتی ہو...... نیند، سکون اور بے نیازی، نیند کھلنے تک موت کا کفن پہنا دیتی ہے...... پہنے رہو...... اتارنا مت — نیند تو کبھی پسند نہیں رہی بالمکند شرما جوش کو...... وہ ہمیشہ یہی کہتے رہے...... جو لاچار اور بیمار ہوتے ہیں، وہی سوتے ہیں...... میں کیوں سونے لگا بھلا...... سوؤں گا بھی تو انگلیوں پر گنے جانے والے چند گھنٹے۔ اور سچ ہے، زندگی برسوں سے اصول اور قاعدے کی اسی سیدھی لائن پر چلتی رہی — بچپن سے عادت بنالی تھی۔ پتا جی بازو والے کمرے میں سوتے تھے۔ پتا جی کی بھی یہی عادت تھی۔ سونے کا نام نہیں ۔رات کے جس پہر بھی اٹھ لو...... ہاتھ میں کتاب دبی ہے۔ گاؤ تکیہ سے لگے پڑے ہیں۔ سرہانے اگالدان پڑا ہے۔ پن ڈبے سے پان نکالتے ہیں پان تھوکتے ہیں۔ اور پھر کتاب پر نظر دوڑنے لگتی ہے۔ تب وہیں اور سارے کے پاس باتھ روم بنے تھے۔ آنگن میں چاپا کل تھا۔ رات میں باتھ روم جاتے وقت پتا جی کے کمرے سے ہو کر گزرنا پڑتا۔ جس کسی لمحے بھی باتھ روم جانے کی نوبت آتی ابا کھکھار اٹھتے......

''بالمکند سوئے نہیں۔''

''سو گیا تھا۔''

''نیند نہیں آ رہی ہے کیا؟''

پھر دبی دبی آواز۔ بلی بہت تنگ کرتی ہے۔'' ذرا نعمت خانے کی کواڑ دیکھ لینا۔ ڈھک ڈھک کی آواز ہو رہی تھی......''

''جی، پتا جی۔''

گفتگو بند۔ ہاتھوں میں پھر سے کتاب آ گئی۔ اور شروع ہو گئیں۔ دلچسپیوں سے بھری آنکھیں......

••

جانے کب بچپن کے انہیں تجربات و واقعات سے گزرتے ہوئے انہوں نے بھی یہی عادت ڈال لی—اس زمانے میں عام شریف گھرانوں کے بچے زیادہ تر گھروں میں قید رہتے تھے۔ ماں باپ کھیل کود اور بچوں کی دلچسپیوں کی چیزیں گھر میں ہی لے آتے تھے...... بچے گھر میں اچھلتے کودتے، کھیلتے باہر نکلنے پر پابندی تھی—یہ سبق بار بار سکھایا جاتا کہ سڑک کے بچے آوارہ ہوتے ہیں، سڑک پر نہیں جانا چاہئے، سڑک کے بچوں کے ساتھ نہیں کھیلنا چاہئے، زبان بگڑ جائے گی، ذہن خراب ہو جائے گا—

تب یہی باتیں عام تھیں۔ اٹھنے بیٹھنے، سجنے سنورنے، ہر جگہ آداب کی پیروی کرنی پڑتی۔ کوئی قدم غلط اٹھتا تو فوراً روک ٹوک کرنے والے موجود ہوتے......

''میاں'، ہر قدم دیکھ بھال کر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اندیشہ ہے کہیں ٹھوکر نہ کھا جاؤ۔'

ٹھوکر کھانے کا خوف اس قدر تھا کہ گھر میں بھی، راستے میں کہیں کوئی روڑا، پتھر نظر آتا تو حساس ہاتھ اسے فوراً بڑھ کر ہٹا دیتا— تب پالکیوں کا رواج تھا۔ گھر کی خواتین پالکیوں پر چلتیں۔

سب جیسے کل کی بات لگتی......اور کل بہت زیادہ پرانا نہیں لگتا......بس جیسے ابھی ابھی پاس سے گزرا ہے...... باہر ڈیوڑھی میں کہار کھڑے ہیں......

''ملکینی کب جائیں گی؟''

''ڈیڑھ بجے۔''

دوبارہ سوال نہیں پوچھا۔ بہت ہوا تو ادھر ادھر ہوئے۔ نہیں تو ڈیوڑھی سے باہر نکل کر سیڑھیوں پر رم گئے — کوئی گزرا تو باادب ہو گئے۔ ہاتھ پیشانی تک جا کر سلام بن جاتے۔

طور طریقے تھے—وقت کا خیال تھا—باہر جانا ہوتا تو گھر کے بڑے بوڑھوں کو بتایا جاتا۔ چودھری شرافت حسین کے یہاں سواری جا رہی ہے۔ رائے بہادر صاحب کے یہاں— گڑھی والے مان سنگھ کے یہاں...... پرانی حویلی والے نریش کمار سنہا جی کے یہاں...... یا پھر الطاف حسین کے گھر، چودھری برکت حسین کے ابا مرحوم۔

پالکی رکھائی۔ خواتین سوار ہوئیں۔ پردے برابر ہوئے۔ کہاروں نے اپنی اپنی جگہ سنبھالی...... ہاتھوں میں تھامے ڈنڈے پر وزن کیا......اور یہ چلی پالکی۔

وقت نے کتنی جلدی ہمارے دستور ہی ختم کر دئے۔ تب دیوانِ خاص اور دیوانِ عام کا رواج تھا۔ ہندو ہو یا مسلمان، تہذیب پر سب جان چھڑکتے تھے۔ مردانہ اور زنانہ ڈیرے الگ الگ ہوتے تھے۔ یہ نہیں کہ منہ گھسیڑا اور اندر باہر ایک کر لیا۔ زنانہ ڈیرے میں جانے کا مطلب ہوتا تھا کہ پہلے خبر کرواتے تھے۔ اندر سے اجازت ملتی تھی، تب مؤدب ہو کر اخلاق کے نمونے پیش کئے جاتے۔

وہ زمانہ ابھی ابھی آنکھوں کے سامنے سے گزرا لگتا ہے۔ خون اور خاندانی ہونے کے گیت گونجتے تھے۔ اگلی پچھلی پیڑھیوں کے کارنامے دیکھے جاتے—اور گھر کے بڑے بوڑھے تو ناک پر بال گرنے کو گوارہ نہیں کرتے۔

تب بچے گھروں میں قید رہتے تھے اور کتابیں پڑھتے تھے۔ لیکن انہی میں سے کچھ لوگ کبھی بھی بغاوت کر جاتے تھے۔ بندشوں اور گھٹے

گھٹے جسم کو جب اچانک آزادی نصیب ہوتی تو بہک جاتے، بے راہ رو ہو جاتے، گلی کوچوں کی خاک چھاننے لگتے، بالاخانے پر ادھر ادھر نظریں طواف کرنے لگتیں — کوٹھے کھلے تھے۔ طوائفوں کے رنگ تھے، گانے بجانے ٹھٹھول تھے۔ پیسہ تھا، دولت کا خمار تھا۔ اور جوانی کی ادائیں تھیں۔ جو بہک جاتے، وہ بہکنے کو بھی خاندانی زیور کا ہی نام دیتے — مسلمانوں میں تو دو دو شادیوں کا عام رواج تھا۔ خود یہی الطاف حسین — پہلی بیوی سے اولاد نہیں ہوئی تو اسے گھر بٹھا دیا۔ دوسری لے آئے تا عمر دونوں سے نبھایا۔ مگر حقیقت میں جس سے اولاد ہوئی وہاں چاہت بھی زیادہ ہوئی۔ اب اس چاہت پر مرد کا حق تو نہیں، بے بس اور مجبور ہوتا ہے مرد، کسی پر لٹائے کسی پر کنجوسی کرے، کس سے نظریں ملیں، کس سے نظریں چھپیں۔ — دل لگا تو معاملہ قتل و غارت تک پہنچ گیا، تلواریں تک نکل گئیں — خاندانی دشمنی چھڑ گئی۔ اب الگ الگ خاندانی زنگ لگتی تلواروں کی دھار کھل رہی ہے لیکن سب کچھ مہذب طریقے سے —

مہذب؟

بالمکند شرما جوش خاندانی ڈور سے کچھ ایسے بندھے ہیں کہ انہیں سب صحیح صحیح نظر آتا ہے۔ غلط بھی صحیح۔ پرانے وقتوں کے لوگوں کی ساری ادائیں جائز لگتی ہیں۔

خود ان کے خاندان میں۔

پتا جی بتاتے ہین، ان کے چچیرے بھائی تھے۔ انیر دھ شرما جوانے مسانے۔ تھے بھی بڑے بانکے سجیلے۔ ہاں کچھ کرتے نہیں تھے۔ زمینداری پر ناز تھا۔ بیٹھ کا جمتا تھا۔ یار دوستوں کی بیٹھکی کھلتی تو...... اور بیٹھکی بھی آج کے چھوکروں جیسی نہیں۔ مہذب دائرے میں...... کسی کو اشارہ کرنا ہوا یا کسی کے حسن کی تعریف کرنی ہے تو وہ بھی شعر و شاعری اور خوب صورت زبان میں — اس وقت گھر کی بالائی منزل پر جوان مردوں کے جانے پر بھی پابندی تھی۔ عام خیال تھا کہ بالائی منزل پر عورتیں ہوتی ہیں۔ بے پردگی کا بڑا خیال تھا۔ ایک دن انیر دھ کوٹھے پر چڑھے تو محلے میں ہی ایک بنیہار کے یہاں آنکھیں لڑ گئیں۔ پھر کیا تھا، دل کی چوٹ کھا گئے، زندگی بدل گئی...... بیٹھکے میں دل نہیں لگتا تھا۔ آنکھیں تھیں تو بام سے الجھی۔ ہوتے ہوتے داستانِ عشق کے چرچے محلے میں ہونے لگے۔ تب جا کر دادا جی کے کانوں تک بھی یہ بات پہنچی۔ پہلے تو خاندانی خوف کا واسطہ دے کر سمجھایا گیا۔ انیر دھ کے مزاج میں ذرا برابر بھی فرق نہیں آیا، تو دادا بزرگوار نے تلوار کھینچ لی۔ جان کے لالے پڑ گئے انیر دھ کے محلے بڑے بزرگوں نے سمجھایا کہ بچہ ہے غلطی ہی کیا ہے اور پریم کا روگ کسے نہیں لگا۔ رشی منیوں سے لیکر پہنچے ہوئے سادھو فقیروں تک...... سب اس روگ کا شکار ہوئے۔ بہت سمجھایا گیا تب جا کر دادا بزرگوار نے شمشیر کی نوک نیچے کی۔ غصے میں تھر تھر کانپتے رہے۔ پھر حکم صادر ہوا...... نا خلف نا ہنجار کو کہہ دو۔ جب تک زندہ رہوں میرے سامنے نہ آئے۔

لوگوں نے لاکھ کہا سنا۔ معاف کر دیجئے، بچہ ہے۔ مگر اس حکم پر اَڑ گئے دادا بزرگوار — منہ سے بات نکل گئی تو قانون کی طرح اٹل ہو گئی۔ اب چاہے جو ہو جائے جھکیں گے نہیں — کہتے ہیں چار پانچ دن اسی لگا چھپی میں گزرے۔ یعنی ایک تماشہ بن گیا۔ کھانا نکلا تھا۔ ابا بیٹھ گئے۔ انیر دھ کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ابا کھاتے کھاتے اٹھ گئے۔ واپس لوٹ گئے — کمرے میں گھوم رہے ہیں۔ انیر دھ کی جیسے بو بھی سونگھ لی تو اپنے کمرے میں گھس گئے۔

ایک سنجیدہ بات کو اچھے خاصے مذاق میں ڈھال دیا تھا لوگوں نے — لیکن زور سے بول نہیں سکتے تھے، ہنس نہیں سکتے تھے۔ معاملہ کتنا سنجیدہ ہے اس کا پتہ تو تب چلا جب بہت دیر ہو چکی تھی...... اور اس سے پہلے کہ دادا صاحب کا غصہ نرم ہوتا، انیر دھ نے منہ سے نکلی بات کی لاج رکھ لی۔ ایک صبح وہ کمرے میں مردہ پایا گیا، اس نے سنکھیا کھالی تھی۔

کہتے ہیں اسی کے بعد دو زیادہ دن تک نہیں جیئے۔ بیٹے سے پیار تو تھا۔ کمرے میں چھپ چھپ کر روتے تھے مگر کسی کے سامنے اظہار کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بیٹے کا جنازہ اٹھا تب بھی نہیں روئے۔ باہر دروازے پر لاٹھی ٹیکے شیروانی کرتا پائجامہ اور ٹوپی میں سر چھپائے مورت کی طرح کھڑے رہے — آنکھوں میں آنسو کا کوئی قطرہ نہیں، شمشان گئے — کریا کرم سب کچھ ہو گیا۔ لیکن آنکھوں سے ایک قطرہ نہیں بہا — ہاں بیٹے سے پیار اتنا تھا کہ گھنٹوں کمرے میں بند رہتے باہر نکلتے تو آنکھیں سوجی سوجی اور پھولی پھولی ملتیں۔

اوراس واقعہ کے کچھ ہی دن بعد دادا بزرگوار کے پنکھ بھی پکھیرو ہو گئے۔ انیر دھ کا پیار انہیں اپنے ساتھ لے گیا۔

تو ایسے ہوتے تھے اس وقت کے مہذب لوگ — تہذیب کسی بندوق کی گولی کی طرح پیدا ہوتے ہی جسم میں داغ دی جاتی تھی۔ بیٹا لاج رکھیو زندگی بھر۔ آخر کس خاندان میں جنمے ہو......'

وقت کے ساتھ تہذیب کی تعریف بھی بدل گئی۔ نئے نئے فیشن، پاپ میوزک......اٹھلاتی چلتی لڑکیاں......اور لڑکے......کہیں امید کا ایک ریلا سا بہتا ہے......پھر اس امید کو مختلف تیز تیز دھارائیں بہالے جاتی ہیں.....ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہیں......

پھر وہی رات......بھیانک......

کروٹیں بدلتے ہیں تو بدن کی ہڈیاں چیخ جاتی ہیں......آنکھ موندتے ہیں تو دنادن گولیاں چلنی شروع ہو جاتی ہیں......گھبرا کر آنکھیں کھول دیتے ہیں۔

یہ سب......

یہ جنوں کا رقص، آنکھیں بند کرتے ہی یہ جنوں کا رقص کیسے اور کیوں شروع ہو جاتا ہے......جیسے چاروں طرف سے حملہ آور تلواریں لے کر ان پر ٹوٹ پڑے ہوں......بچوگے نہیں بچو — اب تم بھی نہیں بچوگے......اب تمہاری باری ہے......

''ہم پر؟''

''ہاں تم پر......''

جیسے دیواریں ہنستی ہیں......

رات کو گونجنے والا چوکیدار کا گھنٹہ ہنستا ہے......جاگ کے سوئیو......

''لیکن ہم کیوں مارے جائیں گے؟''

اندر تک تیزابی ٹھنڈ تیر جاتی ہے......

''کیا اب بس یہی بچ گیا ہے؟ یہی ہونے کو؟ دنگے اور فساد کی ایک نئی کہانی دہرائی جائے گی......ایک نئی کہانی......شیعہ سنی فساد......ذات پات کے نام پر ہونے والے دنگے، ہندو مسلم دنگے......سب پرانے پڑ گئے......اب تلوار کی زد پر تم ہو......''

''وہ چیختے ہیں......لیکن ہم کیوں ہیں؟''

''تم غلط کیوں سوچتے ہو؟''

''غلط؟''

''ہاں غلط — کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ غلط ہے۔ غلط سمجھو گے تو بس غلط ہی رہو گے۔''

''لیکن وہ پاپ کر رہے ہیں......''

آواز بھیگ جاتی ہے......

''چپ رہو۔ سمجھا کرو......وقت کی نزاکت بھی کوئی چیز ہے۔''

'لیکن یہ ہنساتمک راستہ؟''

قہقہہ لگتا ہے......پاگل ہو۔ اپنی آزادی بھی نہیں چاہتے کیا؟ اپنی مکمل آزادی'

''تو کیا اب تک کی آزادی......''

قہقہہ پھر گونجتا ہے......

''پاگل۔ اس آزادی میں تمہارے لیے الگ سے تھا کیا؟ جیسی سب کی تھالی ویسی تمہاری کچھ فرق تو ہونا چاہئے تھا نا......''

آواز اسے کھنگالتی ہے......'' دیکھو جو ہو رہا ہے سمجھو۔ اسے غلط سمجھ کر آنکھوں میں کنکری مت بھرو — ورنہ تم بھی......''

آنکھوں میں دہشت سماتی ہے۔

چودھری برکت حسین آنکھوں میں جگہ گھیرتے ہیں......

اب تم بھی خطرے میں ہو بالمکند شرما جوش۔

''کیوں؟''

''تمہارے نام کے ساتھ جوش لگا ہے......آدھے مسلمان......''

وہ ہنسنا چاہتے ہیں......

''میاں ایسا ہوا تو اِزار بند کھول کر......''

چودھری برکت حسین زوردار قہقہہ لگاتے ہیں...... پھر قہقہہ لگاتے لگاتے ٹھہر جاتے ہیں...... بالمکند شرما چپ ہو گئے ہیں......آنکھوں میں شاید بیتے اتہاس کے کانٹے چبھ گئے ہیں......''

''کھولو گے تب بھی فرق نہیں پڑے گا انہیں۔'' برکت حسین پن ڈبے سے پان نکالتے ہیں......''تب بھی فرق نہیں پڑے گا جوش میاں......کیوں کہ اب ہمارے بعد — تم ہو......تم جیسے سیکولر سوچنے والے......اب وہ چن چن کر تمہیں ختم کریں گے — تم جہاں کہیں بھی ہو گے، تمہیں تلاش کریں گے اور ختم کر دیں گے......''

●●

برکت حسین کسی چھلاوہ کی طرح اوجھل ہو گئے ......مہین آواز برابر گونج رہی ہے۔ کیونکہ اب ہمارے بعد زد میں تم ہو......تم جیسے......تم جہاں بھی......ہو گے تمہیں ختم کر دیں گے۔

بھیانک رات...... جیسے چلتے چلتے ٹیپ پھنس گیا ہو......کانوں کو زور سے بند کرتے ہیں بالمکند شرما جوش......نیند نہیں آ رہی......کم بخت نیند......اول فول خیالات......بچپن سے ڈالی گئی بری عادت کا خمیازہ اب اس عمر میں بھگت رہے ہیں وہ......

ایک بار پھر آنکھیں بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ......سو جاؤں تو تھوڑا آرام مل جائے...... بھاری طبیعت کو قرار مل جائے......پیر ہاتھ کے جوڑوں میں درد ہے...... ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر کڑکڑاتے ہیں۔ پھر آنکھ بند کر لیتے ہیں......اور......وہی چھوٹتی ہوئی گولیاں......دھماکے......بارود......وہ بس ایک خواب دیکھتے ہیں اور ڈر جاتے ہیں۔آنکھیں کھول دیتے ہیں......وہ خواب دیکھتے ہیں کہ ایک ڈھانچہ ہے......نہیں مسجد ہے......ایک ڈھانچہ ہے......نہیں......وہ اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے......لیکن کچھ لوگ......نہیں ڈھیر سے لوگ ......نہیں......اسنکھ لوگ......خوفناک خوفناک شکلوں والے......مل کر توڑ رہے ہیں......اور......

ان میں ان توڑنے والوں میں انیل اور نریندر بھی ہیں۔اس کے بیٹے......

بس آنکھیں بند کرتے ہی پھر وہ یہی خواب دیکھتے ہیں اور ڈر جاتے ہیں۔

شہر آشوب

(۱)

محلے میں تلاشی چل رہی تھی...... پولیس کے آدمی اچانک ہی گھر میں گھس جاتے۔ اسلحوں کی چھان بین کے لیے پورے گھر کا نقشہ بدل دیا جاتا۔ اس کے تحت کتنی ہی گرفتاریاں عمل میں آرہی تھیں جہاں سے اسلحہ برآمد ہوتے۔ پولیس وہاں مردوں کو کھینچتی ہوئی ۲۵ آرمز ایکٹ یا دفعہ ۱۸۸ کے تحت گرفتار کرلیتی۔

تلاشی کا سلسلہ اچانک شروع ہوا تھا۔ جب اڑتے اڑتے یہ خبر عام ہوئی تھی کہ محلّہ کھیم پور میں مسلمان بم بنارہے ہیں۔ حالات پہلے ہی خراب تھے۔ اس افواہ سے فضا تھوڑی اور بوجھل ہوئی۔ بوجھل فضا میں تلاشی لینے کے واقعہ نے سنسنی پھیلا دی۔

دو دن پہلے مین چوک پر توڑ پھوڑ ہوئی تھی۔ کہتے ہیں شاہی مسجد سے پتھراؤ بھی کیے گئے...... پولیس نے الگ الگ مورچہ سنبھالا تھا۔ کنٹرول روم سے فائرنگ کی خبر پاتے ہی دھڑا دھڑ پولیس گاڑیاں چوک کے آس پاس پہنچنے لگی تھیں۔ کسی آتنک وادی نے بم کا استعمال بھی کیا تھا۔ کانچ کے نوکیلے ٹکڑے زمین پر ادھر ادھر چھترا گئے تھے۔ حالات پر قابو پانے کے لیے پولیس کو آنسو گیس چھوڑنی پڑی اور ڈنڈے بھی برسانے پڑے۔

مسجد سے پتھراؤ ہوئے تھے، ایسا ایک پولیس انسپکٹر کا بیان تھا وہ مسجد میں گھس کر پتھراؤ کرنے والے کو پکڑنا بھی چاہتا تھا۔ مگر ٹھیک اسی وقت وائرلیس سے میسج آیا تھا۔ ایسا بھول کر بھی مت کرنا۔ دنگے کی سمبھاؤنا بڑھ جائے گی۔ آس پاس کے مکانوں سے کافی دیر تک پتھراؤ چلتے رہے۔ مین چوک کے قریب کافی پتھر اکٹھا ہوگئے تھے۔ ہوا میں دھول گرد اور بارود کی مہک پھیل گئی تھی۔

اسے بڑے پیمانے پر ہونے والے دنگے ریہرسل کہنا مناسب نہیں ہوگا کیونکہ اب یہ واقعہ شہر کے لیے کوئی نیا نہیں رہ گیا تھا......لوگ ویسے ہی ملتے تھے، باتیں کرتے تھے۔ باہر کی میز اور باہر کی دنیا میں لفظوں میں دوستی اور بھائی چارہ عام دنوں کے جیسا ہی بنا تھا۔ مگر حقیقت میں گھر کے دروازے تک قدم رکھنے کے بعد یہ وچار دھارے تناؤ اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے میں بدل جاتے تھے۔ جن محلوں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی وہ علاقے پاکستانی علاقے قرار دیئے جارہے تھے۔ اور جہاں ہندو اکثریت میں تھے وہ آر ایس ایس چھیتر گھوشت کردیا گیا تھا— کہاں کون زیادہ سہا تھا، یہ کہنا مشکل تھا مگر شہر کے وہ محلے، جہاں مسلمانوں کی تعداد کم تھی، یا نہیں کے برابر تھی، ضرور ضرورت سے زیادہ سہمے ہوئے تھے۔ فضا خراب ہوتی تو اس طرح کے منظر بھی پاکستانی محلوں میں عام ہوجاتے۔ مٹھری، گٹھیر، اٹیچیاں اور بندھے سامانوں کے ساتھ ہانپتی کانپتی برقع اوڑھے مسلمان عورتیں چھوٹے بچوں کا ہاتھ پکڑے یا اپنی جوان ہوتی بچی کو لپٹائے کسی گھر میں داخل ہورہی ہیں۔ پھر سلام علیکم کی زوردار آواز کے ساتھ رونے، گلے ملنے اور سسکیوں کی تیز آواز بھی گونج جاتی...... جو بھاگ کر، گھر بار چھوڑ کر پناہ لینے کے بہانے عزیز، رشتہ داروں کے یہاں چھپتے، وہ اپنے ساتھ جھوٹی خبروں اور افواہوں کی گٹھریاں بھی لاتے۔

''فلاں، مندر سے اعلان ہوا ہے، مسلمانوں کو نماز نہیں پڑھنے دیا جائے گا۔''

''جو مسلمان نماز پڑتے ہوئے دیکھا جائے، اسے مار دیا جائے۔''

''سالم پور سے چار نوجوان لڑکے غائب ہیں۔ چاروں مسلمان تھے۔''

''لاش ملی؟''

''لاش ٹھکانے لگا دی ہوگی۔ رائٹ ہو تو پولیس اور ہندوؤں کی دوستی دیکھنے میں آتی ہے۔''

''ارے سالم پور کیا، کئی محلوں سے مسلمان لڑکے غائب ہیں۔''

''شریف آباد میں ایک مسلمان چھوکڑی کا ایک پولیس والے نے ریپ کیا اور مار کر جھاڑی میں پھینک دیا۔''

ایسا نہیں ہے کہ افواہوں کی یہ گشت صرف پاکستانی علاقے میں ہی تھی۔ آر ایس ایس گھوشت کیے گئے چھیتر میں بھی افواہوں کے یہی تانے بانے تھے۔

''مسلے لڑکے انڈر ویر میں بم چھپائے گھوم رہے ہیں۔''

''ایسے بھی سالوں کو بکرا کاٹنے کی پریکٹس ہوتی ہے۔''

''سر پہ چڑھ کے بولنے لگے ہیں حرامی۔ جہاں موقع لگتا ہے، مارنے سے نہیں چوکتے۔''

''اکبر پورہ میں دو ہندوؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔''

''چمار ٹولی سے چماروں کی ایک لڑکی غائب ہے۔ کہتے ہیں عباس بھائی درزی والے کے لڑکے نچھو سے عشق چل رہا تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے، اس لیے اسے مار کر پھینک دیا۔''

●●

ایسا نہیں ہے کہ پولیس ان افواہوں سے انجان تھی۔ مگر افواہوں سے بچنے کا ہر اعلان خالی وار کی طرح بیکار جا رہا تھا۔ ایسے موقعوں پر افواہیں تو اڑتی ہی ہیں اور صرف اڑتی نہیں ہیں۔ بلکہ چنگاری میں بھس کا کام بھی کرتی ہیں۔ پولیس کے لیے جان مال کی حفاظت کی طرح یہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ ان افواہوں کو روکنا اور افواہیں پھیلانے والے ویکتیوں کو حراست میں لینا — بنا وردی میں بھی پولیس کے جاسوس ادھر ادھر چھترائے ہوئے تھے۔ گولی کوچوں، محلوں، چائے پان دان والوں...... پولس کی الگ الگ چھوٹی بڑی ٹکڑیاں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ نکڑوں پر وائرلیس لیے سپاہی اپنے اپنے افسروں سے مشورہ کر رہے تھے۔ کنٹرول روم میں بیٹھے افسران بھی منٹ منٹ اور پل پل کی خبریں لے رہے تھے۔

شہر میں دہشت کا سماں تھا — لوگ خوف سے اپنے اپنے گھروں میں بند تھے اور بی بی سی کی خبروں پر کان دھرے تھے...... پولیس کی جیپ مکان کے سامنے سے پاس کر جاتی تو بدن میں دہشت سی بھر جاتی۔ رواں کھڑا ہو جاتا۔

پتھراؤ کے بعد حالات اور بھی گمبھیر ہو گئے...... بھاگ دوڑ، افراتفری میں گرتے پڑتے لوگوں کی جماعت، جہاں موقع ملتا، دوڑ جاتی۔ جو انہیں دوڑ پاتے، پولیس کے جوان انہیں ڈنڈوں سے پیٹنے کے اشارے کرتے۔ چوڑی گلی ہوتی، یا سنڈاسوں والی سنکری گلی ہوتی...... ادھر ادھر بھاگتے لوگوں کو پولیس بے رحمی سے کھدیڑ رہی تھی......

پولیس فائرنگ سے ایک آدمی زخمی ہوا تھا — زخمی کو فوراً ہی ایمبولینس میں کر کے اسپتال بھیج دیا گیا — چوراہے پر ایک جگہ گول دائرے میں خون کے نشان جھل مل کر رہے تھے...... آگے دور پر پولیس جیپ کھڑی تھی......

بھگدڑ کیسے مچی؟

صاف صاف کسی کے پاس کوئی جواب نہیں۔ مگر کئی دنوں سے اس ریہرسل کے ہونے کی امید بندھ گئی تھی۔ پچھلے ایک ماہ سے جمعہ میں ہونے والی نماز کا خیال کرتے ہوئے وردی دھاری پولیس ادھر ادھر مسجد کے آمنے سامنے کی دکانوں پر بیٹھ گئی تھی — کرفیو لگنے کا بھی اندیشہ تھا۔ مگر تب تک کرفیو کی کوئی ایسی گھوشنا نہیں ہوئی تھی۔ ہاں جمعہ مسجدوں میں نماز کے لیے آنے والوں میں کمی ضرور آ گئی تھی — سڑکوں پر پولیس گشت بڑھی تھی۔ شام ہوتے ہی دکانیں جلدی جلدی بند ہو جاتیں۔ آپس میں ٹینشن، تناؤ کا ماحول تو بن ہی گیا تھا اور اس پر افواہوں کا مایا جال۔ کل ملا کر دنگوں کی سمبھاؤنا تو بن ہی گئی تھی — دیگر شہروں میں ہونے والے دنگوں سے بھی یہ شہر متاثر ہوتا۔ صبح کے سماچار میں دنگوں کی

خبریں چھپتیں، تو سڑک چوراہوں، پان کی دکانوں پر زور زور سے اخبار سنا رہے لوگوں میں جوش وجذبات اور غصے کا ملا جلا رنگ پایا جاتا۔ ایک دوسرے کے خلاف بڑھ چڑھ کر بولنے کی کارروائیاں شروع ہو جاتیں۔ کہیں گتھم گتھا کی نوبت آجاتی۔ کہیں چھوٹا موٹا جھگڑا ہو جاتا، کہیں چاقو چلنے کی واردات ہو جاتی......

شہر گرم تھا۔

اور اس طرح کی چھوٹی موٹی وارداتیں اسے مزید گرم رکھنے میں معاون ثابت ہو رہی تھی۔

لیکن اس سے پہلے تک کرفیو کی نوبت نہیں آئی تھی اور نہ ہی معاملہ اس طرح پولیس کے ہاتھ سے نکلا تھا۔

●●

اس دن جمعہ تھا۔ اور جمعہ تھا یہی بڑی بات تھی۔ جمعہ کا مطلب مسلمانوں کا دن، ہندوؤں نے اسے اس طرح بانٹا تھا۔ سات دنوں میں پانچ دن ہندوؤں کا جمعہ، جمعرات مسلمانوں کا— جمعہ کا مطلب کرتا پائجامہ۔ جمعہ کا مطلب ٹوپیاں، جمعہ کا مطلب مسجدوں کی طرف بڑھتے ٹوپی پہنے قدم...... جمعہ کا مطلب مسجدوں کی طرف جانے والے راستوں میں ہلچل......اور بدلتے وقت کے ساتھ جمعہ کا مطلب، تناؤ کی فضا، دہشت کا رنگ، وحشت کی ترنگ اور ادھر ادھر دکانوں اور سڑکوں پر پولیس ٹکڑیوں کا جماوڑا— پتھراؤ سے بچاؤ کے لیے کین کے بنے ہڑدل لیے گھومتی وردی دھاری پولیس......اس دن جمعہ تھا اور پچھلے کئی جمعہ نے، اور چھوٹ پٹ، ہونے والے ریہرسلوں نے خطرے کے سائرن تو جانے کب کے بجادئے تھے۔ لیکن لوگوں کی 'کھیج' اور غصہ اسی جمعہ پر اترے گا، یہ کس نے سوچا تھا— جمعہ تھا اور ہندو مسلم افواہوں نے کتنے ہی مسلمانوں کو مسجد جانے سے روک لیا تھا۔ کلیم پور، بہشتی پورا، بہشتی ٹولہ، اکبر پورہ، دالان والی مسجد، محلّہ قریش اور دیگر محلوں میں پولیس کی گشت صبح ہوتے ہی بڑھ گئی تھی۔

جمعہ نماز بعد مسجد سے لوٹتے نمازیوں میں سے کسی کی کسی سے کہا سنی ہوگئی پھر اچانک سڑک پر مارو...... جانے نہ پائے اور بھاگو جیسی چیخیں اور بھاگم بھاگ شروع ہوگئی۔ گرتے پڑتے ادھر ادھر بھاگتے نمازیوں کے سر پر خطرے کی تلوار جھول گئی۔

کین کے ہڑدل لیے سپاہی بندوق اٹھائے حرکت میں آگئے۔ بندوق کی نال ہوا میں اٹھ گئی۔ بھگدڑ مچ گئی۔ شٹر جلدی جلدی گرنے لگے......دھواں بارود فضا میں پھیلنے لگا...... پولیس کی ٹکڑیوں میں سول پولیس کے سپاہی اور ہوم گارڈ فوراً حرکت میں آگئے۔ پولیس جیپ کے سائرن تیز ہوگئے۔ گاڑیاں ادھر ادھر گھومنے لگیں۔

کچھ جگہوں پر آگ لگنے جیسی وارداتیں بھی منٹوں میں ہوگئیں...... دھواں اٹھنے لگا......وسل دیتی پولیس گاڑیاں اعلان کرتی سڑکوں سے گزرنے لگیں— دھواں سڑکوں سے ہوتا ہوا ہوا میں ملنے لگا۔ گھروں کی کھڑکیاں، دروازے جلدی جلدی بند ہونے لگے......جن کی موٹر سائیکلیں تھیں وہ تیز تیز موٹر سائیکلیں بھگاتے ہوئے اپنے اپنے ٹھکانوں پر بھاگ رہے تھے۔

دو ایک جگہوں سے بم دغنے کی آواز بھی آئی۔ کچھ دیر تک فائرنگ کا سلسلہ بھی چلا۔ پولیس میں بھی دہشت تھی۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ پولیس کی حالیہ دنگوں میں مسلمانوں کے ساتھ جو بھومیکا رہی ہے، اس سے مسلمان گٹوں میں ناراضگی بھری ہے۔ کچھ مسلمان پولیس ٹکڑیوں پر حملہ کرنے کے پروگرام بنا رہے ہیں۔

سڑکوں پر بندوق اور وردی دھاری سینا کی ٹکڑیاں دیکھتے ہی دیکھتے چھا گئیں۔ مسجد کے پاس جب پولیس پر پتھراؤ ہوا تو کچھ دیر کے لیے پولیس والے بھی ڈر گئے۔ پر پھر وائرلیس پر میسج ملتے ہی ادھر ادھر دکان کی چھتوں پر برجوں پر گھروں پر چپکے سے گھس کر بالائی منزلوں پر چھپ کر بندوق تانے دنادن فائرنگ کا رخ مسجد کی طرف موڑا جائے۔ حالات سنگین ہیں— ضرورت پڑنے پر دھواں اور آنسو گیس کا ہی استعمال کیا جائے۔

آس پاس کے گھروں سے رونے، چیخنے چلانے اور الاپ کرنے کی آواز بھی اب بھگدڑ کا حصہ بن گئی تھی...... پی اے سی اور پولیس جوانوں کی بوٹ سڑکوں کو روندڈالے رہی تھی۔ ادھر ادھر پی اے سی کے جتھے چھترائے ہوئے تھے مسجد کے پاس آکر ایس پی کی جیپ رکی۔

ایس پی نے باہر آکر گلے میں لٹکے بھونپو سے مسجد میں پھنسے لوگوں کو نکالنے کے لیے اعلان کیا۔ ''جو گھر جانا چاہیں تو وہ بلا خوف نیچے آجائیں۔ ہم انہیں گھر تک چھوڑنے کی ذمہ داری لیتے ہیں......''

پہلے تو مسجد سے چپی رہی، لیکن یہ اعلان دو تین بار گونجا تو پہلے ایک داڑھی والا بوڑھا آدمی نکلا، اس کے چہرے پر دہشت سے ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ماتھے پر گٹھا پڑا تھا۔ ٹوپی سر سے اتار کر اس نے ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

''آجایئے''

ایس پی نے اشارہ کیا تو وہ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا۔

بوڑھے کو دیکھتے ہوئے کچھ لوگ اور بھی اتر آئے — ایس پی نے اسی وقت باقی نمازیوں کو پولیس جیپ میں ان کے گھر بھجوا دیا۔

اسی درمیان شہر کے کئی علاقوں میں، بھڑکنے والے دنگوں کی خبریں بھی آگئیں چاقو، قتل، گولی مار کر ہتیا، اور کئی گروپوں میں جھڑپ کی وارداتیں بھی سامنے آگئیں۔

کچھ ہی دیر میں کرفیو کا اعلان کرتی جیپ سڑکوں سے گزرنے لگی۔ سڑک سنسان ہوگئی۔ ویران ہوگئی — پولیس کی ٹکڑیاں بچ گئیں، پی اے سی کے جتھے رہ گئے۔

اور کین کے بنے ہرڈل لیے بندوق سے لیس سپاہی رہ گئے جن کے جوتے سناٹی سڑک پر بجتے ہوئے خوف اور آتنک پیدا کر رہے تھے۔

(۲)

برکت حسین عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر کمرے میں آئے تو جمیلہ قرآن شریف کی تلاوت میں مصروف تھیں۔ کمرے کی لائٹ تو جل رہی تھی لیکن اندر کچن، باتھ روم اور اوسارے کے پاس کی تمام روشنی گل تھی۔ برکت حسین کے قدموں کی چاپ نے جمیلہ کو مڑ کر دیکھنے کو تو مجبور کیا لیکن ایک سہمی ہوئی نظر ان پر ڈال کر وہ دوبارہ لرزتی آواز میں کلام پاک میں کھو گئیں۔

چارپائی پر نشی سو رہی تھی۔ منا یعنی ان کے لڑکے تنویر حسین کی بچی — تنویر حسین بڑے ہو گئے۔ شادی ہوگئی۔ بچے ہو گئے لیکن کل کے منا اور آج کے منا۔ نام اپنی جگہ بنا رہا۔ کتنی بار تنویر نے ابو کو منع کیا۔ ابو آپ سمجھتے نہیں۔ اچھا لگتا ہے کیا۔ دوست احباب آتے ہیں۔ برکت حسین مسکراتے بھائی زبان کو کیسے سمجھاؤں۔ تنویر کہتے ہوئے لڑکھڑا جاتی ہے زبان۔ بچپن سے منا ہی بولتا آیا ہوں۔ سو منا ہی کہوں گا۔ اب چاہے تم ناراض ہو، تمہاری مرضی۔

منا بجلی آفس میں کلرک تھا۔ کلرکی سے خوش نہیں تھا۔ اس کے کئی دوست تجارت میں تھے۔ وہ بھی تجارت میں جانے کا خواہش مند تھا۔ لیکن چودھری برکت حسین کو گوارہ نہیں تھا۔ نہیں میاں۔ اب اتنے بھی گئے گزرے نہیں ہم کہ آٹے دال کی دکان کھول کے بیٹھ جائیں سرکاری نوکری کرتے ہو، دفتر جاتے ہو، شام کو گھر آتے ہو، یہ زیادہ ٹھیک ہے۔''

وقت کیسے بدل رہا ہے۔ زمانہ کتنا بدل گیا۔ اس کی پہلی تھاپ تو اس وقت ہتھوڑے کی طرح ان کے ذہن پر پڑی تھی۔ جب منا نے باہر کی بیکار پڑی زمین پر دکان اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ بپھر گئے تھے۔

''پاگل ہو گئے ہو باپ دادا کی جائیداد کو کوئی ایسے رسوا کرتا ہے۔ اور وہ بھی اس طرح دکان کے لیے اٹھوا کر۔''

منا غصہ ہو گیا —

''لوگ پاگل ہمیں کہتے ہیں ابا۔ اتنی سی زمین۔ چار پانچ دکانیں تو کہیں نہیں گئی ہیں۔''

’’لیکن یہ جو پھلواری ہے۔‘‘

برکت حسین کا دل پسیج گیا...... یہ خوبصورت پھول بوٹے......بچپن کے دنوں میں یہیں تو کھیلتے کھیلتے بڑے ہوئے تھے۔کرسیاں نکلتی تھیں۔ بیلا، چمیلی اور رات کی رانی کی خوشبو سے فضا معطر ہو جاتی۔کبھی رات کے وقت ان میں جگنو بھی لہراتے، گپیں ہوتیں، چائے پی جاتی......وہ دن، وہ زمانہ......

مگر منا اڑ گیا—

’’پرکھوں نے دنیاداری سمجھی تھی کب ابا۔سمجھتے تو ٹھیل ٹھال کے خالی یہ گھر نہ ہوتا۔نام کے ہیں خاندانی ہم۔گھر میں اناج نہیں ڈھکتا۔‘‘

’’یہ سب کسے سنا رہے ہو‘‘ وہ بگڑ کر بولے۔

’’سناؤں گا کسے۔اپنی قسمت کو کوستا ہوں۔نشی بڑی ہو رہی ہے۔اور آپ سمجھتے نہیں۔

’’نشی—‘‘

’’ننھی منی دو برس کی نشی پر نظر مرکوز ہو گئی۔‘‘

منا غصے میں اٹھا۔’ایک تو لڑکی ہوئی، خرچے کا گھر— بڑھتی خانہ داری اور مہنگائی۔کیا کھائے کیا جمع کرے آدمی۔آپ کو سوچنا چاہئے ابا۔دو دکانیں بھی اٹھ گئیں، تو نشی کے جہیز کے واسطے بینک میں کچھ پیسے جمع ہو جائیں گے۔کلرکی سے ملتا کیا ہے جو بڑا ہونے پر اس کے جہیز میں دوں گا— دو دکانوں سے گھر کی رونق نہیں ختم ہو جائے گی اور گھر میں ہے کیا۔موٹی موٹی دیواریں، بے سلیقہ کمرے— پرانے لوگوں کو کوئی شعور ہی نہیں تھا مکان بنانے کا۔صرف کھانے پینے کا شوق تھا۔

چودھری برکت حسین نے دیوار پر پان کی پیک تھوکا۔ناراض ہو گئے۔

’’جو مرضی ہو کرو، لیکن خاندان کو مت کوسو۔آبا و اجداد کو گالیاں مت سناؤ۔میاں نصیبوں والوں کو ایسے خاندان ملتے ہیں۔‘‘

’’ہیں......نصیبوں والوں کو......‘‘

منا پھر بڑبڑایا۔نشی رونے لگی تو شمیم کو زور سے ڈانٹا۔

’’چپ کرا شمو بچی کو— دیکھتی نہیں۔ بننے سنورنے سے فرصت نہیں ہے۔‘‘

’’لو۔ابا کا غصہ اب ہم پر اتار رہے ہیں۔‘‘

نشی پھر روئی۔

منا نے آگے بڑھ کر چھوٹی سی بچی کو کونچ کے اٹھایا۔شمیم کی گود میں لا پٹکا۔

’’اسے چپ کراؤ۔‘‘

شمیم غصے میں نشی کو لے کر کمرے سے نکل گیا۔

برکت حسین خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔یا اللہ...... یہ کیسے بچے ہیں......آداب......تہذیب......

لیکن آداب اور تہذیب کسے سمجھاتے خود کو ہی تسلی دیتے ہیں۔ نئے زمانہ کے بچے زیادہ پریکٹیکل ہیں۔ان سے زیادہ پیسوں کی قدر کرتے ہیں۔دور کی سوچتے ہیں۔کل کی فکر کرتے ہیں۔چلو۔ باہر دو دکان اٹھ ہی گئی تو کیا ہوگا۔اٹھنے دو۔نشی کی فکر ہے۔ٹھیک ہی سوچتا ہے بیچارہ۔لڑکیوں کی کیا بری گت ہو رہی ہے۔کل تک کم از کم مسلمانوں کے یہاں یہ جہیز جیسی لعنت نہیں تھی۔کم از کم ان کے جیسے لوگ تو کبھی دینے لینے کے بارے میں سوچتے بھی نہیں تھے۔اب وقت ہے تو سوچنا پڑ رہا ہے۔چلو میاں انسان کو ہر طرح کا وقت دیکھنے کے لیے تیار رہنا چاہئے—

ہر طرح کا وقت—اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کے بچپن کی یاد کا وہ ٹکڑا آنکھوں کے سامنے سے گم کر دیا گیا۔نہیں توڑ دیا گیا۔مزدور لگ گئے۔ باہری صحن کا ایک حصہ دکان کی نذر ہو گیا۔مزدور کام کرتے رہے، وہ اندر کمرے میں دھمک سنتے رہے۔ باہر نکلنے کا جی نہیں کرتا۔ باہر

آتے تو زبردستی اُمڈ آئے آنسوؤں کو روک نہیں پاتے۔ آنسو دابے پھر اپنے کمرے میں لوٹ آتے...... دکان مفت میں ہی بن گئی۔ سڑک پر کا مکان — آس پاس کے سارے مکانوں میں سے دکان کے حصے نکل چکے تھے۔ صرف ان کا مکان باقی تھا۔ جس پر وہ فخر کرتے تھے...... اتنا بڑا صحن اور بچپن کی یادیں — ایڈوانس کی رقم قبول کر لی۔ مزدوروں کو بلا کر ہاتھ لگا دیا۔ دکانیں نکل آئیں......

— چلو پیسوں کا ایک اور راستہ تو نکلا — منا خوش تھا —

برکت حسین بھی منا کی خوشی کے آگے جھک گئے۔

●●

جمیلہ نے کلام پاک بند کیا۔ آنکھوں سے چوما، جز دان میں رکھا اور پلٹ کر شمیم کی طرف دیکھا۔

''نشی سو گئی؟''

''ہاں اماں —''

جمیلہ، ہڑبڑائی سی، سہمی ہوئی باہر دروازے کو جھانک رہی تھی۔

جمیلہ نے پوچھا۔

''منا آیا؟''

''نہیں ابھی تک نہیں آئے۔''

''ہائیں —''

برکت حسین چونک گئے۔ ''بہو، کہاں گیا ہے منا۔''

''پتہ نہیں۔ کہہ رہے تھے، یہیں پاس میں جا رہے ہیں۔''

''تم نے روکا نہیں۔''

شمیم کے 'ٹسوے' چو گئے۔ آواز بھرا گئی۔

''روکتی کیسے نہیں۔ لیکن آپ کو تو معلوم ہے۔ وہ کسی کی سنتے کہاں ہیں۔''

جمیلہ غصے میں بولی۔

''سنتے نہیں ہیں تو مت سنیں۔ تم نے کیوں جانے دیا۔''

''لو اماں بھی ہمیں کو ڈانٹنے لگیں، شمیم باضابطہ رونے لگی۔ ''جیسے ہمارا ہی سب قصور ہے۔''

''رومت بہو، رومت......''

برکت حسین کمرے میں ٹہلنے لگے...... ''پاگل لڑکا۔ بیوی بچے گھر پر ہیں۔ اسے خود سمجھنا چاہئے۔ شہر میں کرفیو لگا ہے۔ زمانہ خراب —'' وہ اچانک چونکے۔

''لیکن اس وقت کہاں گیا ہوگا۔ اور کیسے گیا ہوگا۔''

''کہہ رہے تھے۔ ان کے پاس کرفیو کا پاس ہے۔''

''لو ان سے سنو۔'' جمیلہ منہ بسور کر بولی۔ ''کرفیو کا پاس کیسے بنے گا۔ جیسے ہم ہی نہیں جانتے ہیں۔ ارے پولیس والے آسانی سے پاس کہاں بناتے ہیں دس طرح کا سوال پوچھتے ہیں۔ کہاں جانا ہے۔ کون مر گیا ہے، کون بیمار ہے۔ اتنی جرح کے بعد پاس بناتے ہیں۔''

''اب ہمیں کا معلوم اماں۔'' شمیم کی پھر رلائی چھوٹ گئی۔

''بہو اللہ اللہ کرو، رومت۔''

شمیم اور تیز رونے لگی۔ ''میری تو قسمت پھوٹ گئی۔ میری تو کوئی بات ہی نہیں ہے نہ کہنا، نہ سننا، ارے کوئی لائے ان کو...... پتہ نہیں

کہاں گئے ہوں گے۔

چودھری برکت حسین نے لہجہ سخت کیا۔ ''بہو منحوسیت مت پھیلاؤ۔ سر پھرا لڑکا ہے۔ خیر خوبی سے آجائے گا۔''

چودھری برکت حسین آگے بڑھے...... دیوار پر کچھ پڑھتے ہوئے انگلی سے لکھنے لگے...... لکھ کر تالی بجائی۔ قدرے اطمینان سے شمیم کی طرف دیکھا۔

''اب اطمینان رکھو۔ منا کہیں بھی ہوگا، آجائے گا۔''

برکت حسین خود بھی مطمئن تھے۔ یہ بھی ابا سے سیکھا تھا۔ کوئی چیز گم ہو جائے، کوئی مصیبت میں پھنس جائے تو جھٹ دیوار پر **اِنَّــــــا لِلّٰہ**...... لکھ دو۔ مسافر جس کسی حالت میں ہوگا جہاں ہوگا، لوٹ آئے گا۔ اتنا اعتقاد تھا— لیکن دل کا کیا ہو۔ دل کی گھبراہٹ جاری تھی۔ اس بیچ یہ ہوا، نشی رونے لگی۔ شمیم نے آگے بڑھ کر نشی کی پیشانی ٹھوکی...... سو جا...... سو جا...... بیٹا......

نشی چپ ہی نہیں ہو رہی تھی۔ نشی کو جھنجلا کر شمیم نے ایک چانٹا لگایا۔ کم بخت برے وقت میں اور کام بڑھا دیتی ہے۔''

''بہو، بھوکی ہوگی۔ دودھ دانی تو اس کے منہ سے لگا دو۔''

''ارے ہاں''، شمیم ایک دم سے چونکی۔ بغل میں پڑی دودھ دانی نشی کے منہ میں دے دی۔

دودھ کے بغیر بلکتی بچی نے منہ بچلا کر گردن ادھر ادھر کی، پھر دودھ دانی کا نپل منہ میں داب لیا۔ اب اس کی رلائی بند ہو گئی تھی۔

''چپ ہو گئی۔ کمینی۔ پریشان کر دیتی ہے۔''، شمیم غصہ ہوئی۔

برکت حسین کو ناگوار گزرا۔

''بہو۔ اچھے خاندان کی بہو بیٹیوں کے یہ طور طریقے نہیں ہوتے۔''

''کیا کروں ابا۔ جی پریشان ہے۔''

''پریشان جی پر قابو رکھو بہو''

''رات بہت ہو گئی ہے بہو۔''

جمیلہ کا دل بھی گھبرانے لگا تھا۔ ''یا اللہ'' وہ پھر بہو کی طرف دیکھ کر بولیں۔

''ہمیشہ جھگڑتے رہتے ہو تم دونوں۔ کہیں چلا گیا ہوگا۔''

''پھر کہیں کوئی جھگڑا کیا، کیا؟''

''نہیں اماں، قرآن پاک اٹھوا لو۔''

''پاگل لڑکی۔''، برکت حسین بگڑے۔ یہ بات بات میں کلام پاک نکالنا۔ یہ طور طریقے تو ہمارے یہاں کبھی رہے نہیں بہو۔ اب...... یہ بھی ہوگا اس گھر میں۔''

''دیکھیے ابا— ''، شمیم بپھر کر بولی۔ ''اس وقت میں بہت پریشان ہوں۔ زمانہ خراب اور وہ گھر میں نہیں ہیں۔ اس وقت مجھے کوئی نصیحت مت کیجئے۔ کچھ الٹا پلٹا منہ سے نکل آئے گا تو...... میں ہی بدنام ہوں گی کہ سسر ساس کے منہ لگتی ہے...... قسمت ہی پھوٹ گئی نگوڑی شوہر ہے تو وہ بھی پوچھتا نہیں۔''

شمیم کے پاس آخری ہتھیار تھا۔ رونا...... وہ زور سے کلپنے لگی تھی۔

جمیلہ دھیرے دھیرے کچھ بڑبڑانے لگی۔ کچھ ایسی آواز میں جو صاف سنائی نہیں پڑ رہی تھی۔

چودھری برکت حسین انتشار اور غصہ کے عالم میں باہر نکل آئے۔ کم از کم بہو کی باتیں تو نہیں سننی پڑیں گی۔ دروازہ بند تھا۔ کرفیو کے بعد کا سناٹا کتنا ظالم ہوتا ہے...... جیسے ہوائیں مقتل گاہ میں شور کر رہی ہیں...... جیسے کسی قبرستان کا ہولناک سناٹا ہو...... چمگادڑیں اور سوروں کی منحوس آوازیں گونج رہی ہیں...... شاخوں سے الو بول رہے ہوں...... درخت ہلتے ہوں اور ایک وحشت ناک سناٹگی۔ اندر تک تیزاب الٹ دیتی

ہو......

خواہش ہوئی دروازہ کھولیں......

''منا نہیں آیا، کیوں نہیں آیا؟''

ہاتھ کنڈے تک بڑے۔ پھر واپس لوٹ آئے......

''کہاں گیا ہوگا کم بخت......؟''

وہ خود سے بڑبڑائے۔ الٹی کھوپڑی کا ہے کم بخت۔ یہ آج کے بچے۔ نہ کہنا نہ سننا۔ ماں باپ کو تو حقیر نظروں سے دیکھتے ہیں۔ جیسے ماں باپ کچھ ہوں ہی نہیں۔ مگر منا......

دھیرے سے کواڑ کی کنڈی تک پہنچتے ہیں۔ کنڈی نیچے گرتی ہے تو گھڑ......کی آواز شور بن کر دل میں چبھ جاتی ہے۔

دروازہ اور ان سے دو قدم پیچھے جمیلہ کھڑی ہے۔

''یہ کہاں جا رہے ہیں؟''

''باہر۔''

''دماغ خراب تو نہیں ہو گیا۔ پہلے لڑکا گیا اور اب آپ......''

وہ غصہ ہوئے۔ '''کہیں نہیں جا رہا ہوں، بس دل گھبرا رہا ہے۔''

''کہاں گیا ہوگا؟''

''خدا معلوم۔''

''تمہیں بھی بتا کر نہیں گیا۔''

''ارے پاگل ہوں میں جو بتا کر گیا ہوتا تو آپ کو نہیں بتاتی۔ اچھا، کمرے میں آ جائیے۔ چائے کی طلب ہو تو کہیے۔''

''نہیں۔''

''تو پھر دروازہ بند کیجئے۔ آ جائیے اندر'' اس بار جمیلہ چیخ کر بولی۔

وہ مڑے—— دماغ مت چاٹو—— شاید آ رہا ہو، دور سے اس کے قدموں کی چاپ ہو......

''ہونہہ، تو پھر باہر ہی پریشان ہوئیے۔''

جمیلہ واپس مڑ گئی۔

ایک منٹ وہ منجمد کھڑے رہے۔ مگر داد دیتے تھے جمیلہ کے صبر و سکون کی۔ منہ کی تیز ہے۔ لیکن پیدائشی صابر عورت ہے۔ ایسی عورتیں دنیاوی معاملات اپنے ساتھ نہیں رکھتیں۔ سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیتی ہیں۔ جیسی اللہ کی مرضی۔ پریشان ضرور ہے جمیلہ، لیکن دل ہی دل میں اللہ سے دعا کر رہی ہوگی، بچے کی سلامتی کے لیے خیر خوبی سے واپس آنے کے لیے......

کنڈی کھسکا کر تھوڑا سا کواڑ کھولتے ہیں، پھر تھم جاتے ہیں...... وہی قبرستان جیسی خاموشی۔ سنسان سڑک۔ مردے لوٹتے ہوئے، دھڑ سے دروازہ بند کیا۔

واپس کمرے میں آئے تو جمیلہ خود ہی چائے بنا کر لا چکی تھی۔

''لو چائے پیو۔''

اتنا کہہ کر وہ تسبیح لے کر بیٹھ گئی۔ چائے کی گھونٹ لیتے ہوئے وہ جمیلہ کو دیکھ رہے ہیں...... وہ اپنی دعاؤں میں گم ہے...... ہونٹ چل رہے ہیں، ہاتھ تسبیح کے دانوں پر گھوم رہے ہیں۔

●●

دو دن پہلے—

منا کی بجلی آفس میں لڑائی ہوگئی تھی۔ اس دن وہ بل جمع ہونے والی کھڑکی پر تھا۔ لوگوں سے ہونے والی ماتھا پچی سے گرم تھا کہ ایک دیہاتی کا نمبر آیا۔

دیہاتی نے غصے میں بل دکھایا۔ چیخ کر بولا۔

''ہمکا پاگل سمجھو ہو کا کہ ای دوئی مہینے کا پانچ ہزار کا بل بھیج دیہو۔ دیماگ تو تہرا ٹھیک ہے۔''

''ابے تمیز سے بات کر۔''

''لو۔ ان کا سنو، اب ای، تمیج سکھات ہیں ہم کو۔'' دیہاتی تاؤ کھا گیا۔

قطار لمبی تھی۔ منا نرمی سے بولا۔

''وہ سپرنٹنڈنٹ صاحب بیٹھے ہیں۔ جو پوچھنا ہے ان سے پوچھو۔''

''کا ہے۔ ہم تو راؤر سے ہی کہیں گے۔ آپ کھڑکی پر بیٹھے ہو۔''

منا گرم ہوگیا۔ وہ کرسی سے اٹھا، دیہاتی پر برس پڑا۔

''جانے کہاں کہاں سے چلے آتے ہیں صبح سویرے۔ کام کسی کا لے آتے ہیں کسی کے پاس۔ میرا بھیجا مت چاٹو۔ وہاں سپرنٹنڈنٹ صاحب بیٹھے ہیں۔ انہی کا چاٹو۔ اب نکلو یہاں سے ورنہ۔''

اس کے منہ سے ایک غلط جملہ نکل گیا۔ 'باہر نکل آیا تو پھکوا دوں گا سڑک پر۔'

''کیا کہا۔''

دیہاتی غصے میں چڑھ دوڑا، آستین برابر کی۔ ہاتھ نچا کر ایسے دوڑا جیسے درمیان میں کھڑکی کے راڈ نہ لگے ہوتے تو جان ہی لے لیتا......

''توری ای مجال میاں جی۔ ابھی بتاتے ہیں۔''

وہ تو خیر ہو دوسرے لوگوں نے بیچ بچاؤ کیا۔ اور دیہاتی کو سمجھا بجھا کر سپرنٹنڈنٹ کے پاس لے گئے۔ مگر منا کا دماغ بھک سے تھا۔ میاں جی۔ دیہاتی کے منہ سے نکلے اس لفظ میں وہ اپنے لیے صرف گندگی دیکھ رہا تھا۔

●●

اس دن آفس سے لوٹا تو منہ پھولا ہوا تھا۔

برکت حسین نے پوچھا تو ساری رام کہانی سنا دی پھر چڑھ کر بولا۔

''سالے، یہ ذرا سی بات پر میاں اور مسلمان نکالنے لگتے ہیں۔ دو کوڑی کے سالے۔ ہم سے مقابلہ کرتے ہیں۔ یہاں اب رہنے کا نہیں ہے ابا۔ وہ تاؤ کھا رہا تھا۔ خدا معلوم۔ آپ لوگوں کو کیا سوجھی کہ یہاں رہ گئے پاکستان کیوں نہیں چلے گئے۔ اتنی بے عزتی تو نہیں سہنی پڑتی،

بول بلا کر وہ چپ ہوگیا۔ مگر برکت حسین کو لگا، انہیں سمجھانا چاہئے تھا۔ بے عزتی کون کہاں سہہ رہا ہے۔ اس پر گفتگو کرنی چاہئے تھی۔ یہ بچے ذرا دیر میں کیسے ہوجاتے ہیں۔ منہ سوج جاتا ہے، منہ سے نازیبا کلمات نکل جاتے ہیں...... گالیاں تک دے جاتے ہیں......'

برکت حسین کو یاد آیا۔ رات میں کھاتے وقت بھی منا غصے سے بولا تھا۔

''آپ ہی لوگ کھیر کھا کر نرم ہو کر گھر میں بیٹھ رہیے ابا۔ ہم کا ہے بیٹھیں گے۔ ہم کسی سے کم ہیں کیا؟ ہم کو غیرت نہیں ہے۔ وہ جو چاہے بول دیں، گالیاں دے دیں۔ ارے ہم کو گالی دے دیں، سو جوتے مار لیں، سہہ جائیں گے، مگر مذہب کو...... نا...... کمینیوں کا حوصلہ بڑھتا رہے گا۔ اب چوڑی پہن کر گھر میں ڈھکے رہنے کا وقت نہیں ہے ابا— میں تو صاف لڑائی کر لیتا ہوں۔ کوئی بولے نہ میرے سامنے۔ ذرا بول کر دیکھے۔''

''کیوں لڑائی کرتا ہے۔ کیا فائدہ؟''

''فائدہ وائدہ میں نہیں جانتا ابا۔ آخر ان کا کیا فائدہ ہے کہ وہ ہمارے خلاف بولتے ہیں۔ کیا ان کے بولنے سے مسلمان چلے جائیں گے، اس ملک سے۔''

وہ چپ ہو گئے، لگا، ماحول کے زہر نے ایک آگ منا کے اندر بھی بھر دی ہے۔ اور وہ واقعات کی سرپھری ہوا کا مقابلہ کرتے ہوئے زہریلا ہو گیا ہے۔ زہریلے بھبھکے ہی چھوڑتا ہے۔ وہ مدتوں سے برسوں سے یہی سب دیکھتے ہوئے بڑا ہوا ہے...... اور اب دیکھنے اور برداشت کرنے کی حد سے باہر نکل کر خطرناک ہو چکا ہے —

ان کا جی چاہا، وہ منا کو سمجھائیں، اسے آنے والے خطرے سے آگاہ کریں۔ تب ہی نشی چیخ دیتی ہے۔ وہ نشی کو دیکھتے ہیں...... ایک نسل اور بڑی ہو رہی ہے...... اسی دنگے اور فساد کی فضا میں...... اسی خونی ٹانڈو میں...... اسی تناؤ اور وحشت کے رقص کے درمیان...... اسی مذہبی خلفشار میں...... یہ بچے ابھی سے کرفیو دیکھ رہے ہیں...... آسمان پر پھیلتا دھواں دیکھ رہے ہیں...... کمرے میں پھیلی گھٹن دیکھ رہے ہیں......

وہ منا سے کچھ کہنا چاہتے ہیں، مگر اب گونگے ہیں...... آواز ہونٹو پر آ کر تھرا جاتی ہے...... برف بن جاتی ہے......

وہ صرف سہم جاتے ہیں کہ اس عمر میں وہ صرف سہم ہی سکتے ہیں۔ وہ جنہیں گزرے کل کا اتہاس بننے میں ابھی بہت دیر باقی نہیں ہے۔''

●●

منا نہیں آیا۔

رات دھیرے دھیرے سرک رہی ہے......

روتی بسورتی شمیم کے رخسار کے آس پاس کتنے ہی بے چین آنسو کی، بوندیں جم گئی ہیں......

برکت حسین خوف میں نہا گئے...... کہیں منا نے کوئی غلط حرکت تو نہیں کر دی...... کہیں کچھ ہو تو نہیں گیا؟

کچھ غلط؟......

کوئی حادثہ......؟

دل رہ رہ کر دھک دھک کر رہا ہے......

شمیم کا رونا بند ہے...... بچی کے پاس پلنگ سے ٹیک لگائے ہے...... شاید آنکھوں میں نیند اتر رہی ہے......

جمیلہ اور ان کی آنکھیں ملتی ہیں تو وہ جمیلہ کی آنکھوں میں بھی اب صاف صاف ظاہر ہو رہے خطرے کے نشان دیکھتے ہیں......

رات دھیرے دھیرے سرک رہی ہے......

پو پھٹ گئی

مرغ نے بانگ دیا۔

مگر منا نہیں آیا۔

گھر میں جیسے ماتم کی فضا تھی۔ جمیلہ کا صبر بھی رات کے ڈھلنے کے ساتھ دم توڑ گیا تھا۔

●●

(۳)

نیل کنٹھ — عمر ۲۵ سال — گھنی گھنی مونچھیں۔ پسندیدہ لباس۔ سفید کرتا پائجامہ، بنڈی — ایک جیپ ہے جسے ہمیشہ ساتھ لے کر گھومتا رہتا ہے۔ کچھ دور سے جاننے والے اسے نیتا جی کہتے ہیں۔ یار دوست نیل کنٹھ ہی کہتے ہیں۔ یاروں کا یار ہے۔ پان خوب کھاتا ہے۔ باتیں مزے کی کرتا ہے۔ منطق اور دلیلیں نہیں سمجھتا۔ بی اے فیل ہے دوبارہ بی اے فیل ہوا تو نیتا گیری کے دھندے میں لگ گیا۔ شروع کے کچھ ایک سال رولنگ پارٹی کا ساتھ دیا یعنی جو پارٹی رہی اسی کے ہو کر رہ گئے۔ پیسہ کمایا اور موج اڑایا — لیکن پچھلے دو سالوں سے بھاجپا کے

بھکت ہیں۔ مرلی منوہر جوشی، آڈوانی، اور باجپائی کی بڑی بڑی فریم کرائی تصویریں ڈرائنگ روم میں پڑی ہیں۔ اور صبح سویرے ان کی پوجا کی جاتی ہے۔

نیل کنٹھ میں اس کے علاوہ بھی کئی اور خاص گن ہیں ـــ بہت جلد آپ کے دوست بن جائیں گے ـــ ایک بار دوست بن گئے تو پھر گھریلو بننے میں دیر نہیں کریں گے، وہ اسے سوشل ورک کہتے ہیں۔ بات کیجئے تو کہیں گے، چناؤ کی سیڑھیاں طے کرنے کے لیے یہ سب بہت ضروری چیز ہے ـــ یہ سب تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ جنتا کا دل نہیں جیتیں گے تو وہ ووٹ کیسے دیں گے۔

نیل کنٹھ کی ایک خوبی اور بھی ہے، چہرہ ہر وقت کھلا کھلا اور مسکراتا رہتا ہے کوئی کام ہو، چاہے نہیں ہونے والا ہو، مگر انکار نہیں کرے گا نیل کنٹھ، حامی ضرور بھر لے گا۔ یہ بھی ممکن ہے اگلی بار آپ سے کام نہ ہو پانے کی صورت میں کوئی خوبصورت سا مناسب بہانہ بھی پیش کر دے، مگر اس صفائی سے جیسے کوئی ماہر سرجن آپریشن کے وقت انجام دیتا ہے۔ کچھ لوگ نیل کنٹھ کو 'اجڈ' (بمعنی لفنگا) بھی کہتے ہیں۔ مگر یہ ٹھیک نہیں۔ نیل کنٹھ کو اپنی نیتا گیری سے ہی فرصت نہیں ہے۔ شہر میں تناؤ بڑھا تو جیسے نیل کنٹھ کا کام بڑھ گیا۔ تقریر کرنا آتا تو نہیں مگر وہ جو کہتے ہیں کہ مجبوری اور پیسہ کچھ بھی کرا لیتا ہے، سو تقریر بھی کرا لو۔ مائیک کے سامنے کھڑے ہیں، اٹک اٹک کو بول رہے ہیں۔ مسکرا رہے ہیں ـــ پڑھا کل جو بھی ہو، مگر اب وہی کہتے ہیں جو پارٹی کے 'وکتا' نلکانی صاحب اور امرجیت صاحب رٹاتے ہیں...... اور پھر رٹے رٹائے طوطوں کی طرح محفلوں میں، سبھاؤ میں شروع ہو جاتے ہیں نیل کنٹھ صاحب۔

ان کا صاف صاف کہنا ہے ـــ اگلا چناؤ دیکھیے ''ایم پی نہیں تو ایم ایل اے''...... وہ بھی نہیں تو 'ایم ایل سی' تو بن کے ہی رہیں گے۔

''اگلا چناؤ کب ہوگا۔''

''بہت جلد اور دیکھیے گا ہماری پارٹی ہی جیتے گی۔''

کوئی پوچھتا:

''ہماری پارٹی! مطلب! آپ تو آر ایس ایس کے ہیں۔''

بچوں جیسی مسکان چہرے پر بکھیرتے ہیں نیل کنٹھ صاحب۔ 'یہی تو نہیں سمجھ پا رہے ہیں آپ'۔

''یعنی بیچ میں کچھ گورکھ دھندہ ہے۔''

''نہیں سمجھے آپ، گورکھ دھندہ نہیں ـــ چالاکی...... نہیں چالاکی بھی نہیں...... وہ ٹھہرتے ہیں...... ویسے جنتا سب سمجھتی ہے...... اب دیکھیے۔ ایک ڈنڈے سے آپ سارے جانور کو تو ہانک نہیں سکتے۔ نہیں سکتے نا...... سوئی لوگ ہوتے ہیں اور جانور بھی الگ الگ مزاج کے۔ اور سمجھانا پڑتا ہے سب کو۔ یہ تو جانوروں کی بات ٹھہری اور یہ بات دیش کی ہے۔''

''پہیلیاں کیوں بجھاتے ہیں، نیل کنٹھ صاحب!''

''تو صاف صاف سنیے۔ اب آپ تل ہی گئے ہیں تو...... مونچھ اینٹھتے ہیں نیل کنٹھ پھسپھسانے والے انداز میں گویا ہوتے ہیں...... سب ایک ہے...... آپ کو تو پتہ ہی ہے۔ آر ایس ایس، بھاجپا، وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل ایک ہی چیز ہیں۔ قاعدے قانون اور صحیح پر سلجھن کے لیے آر ایس ایس ہے۔ لڑنے مرنے کٹنے یعنی فوج کا کام کرتی ہے بجرنگ دل اور راجنیتک استعمال کے لیے ہے بھاجپا ـــ''

نیل کنٹھ ہنستے ہیں۔ ''ای کون نہیں جانتا۔''

''تو آپ کا سمبندھ کس سے ہے؟''

''آپ سے ہے؟''

''مطلب؟''

''آپ جنتا ہیں تو آپ سے ہے ـــ ہمارا کام آپ کو گائیڈ کرنا ہے۔''

نیل کنٹھ کہتے ہیں۔ ''جانتے ہیں نا۔ گائیڈ کا کام کیا ہوتا ہے۔ وہی ہمارا کام ہے۔''

''تو گویا آپ ہمارے گائیڈ ہوئے۔''

''ارے اصل گائیڈ تو اس وقت ہوں گے جب آپ ہم کو ووٹ دیں گے۔''

نیل کنٹھ دھڑ دھڑا کر جیپ آگے بڑھا لیتے ہیں۔ ڈگی میں ولس نیوی کٹ کا ڈبہ پڑا ہوتا ہے۔ ڈبے سے سگریٹ سلگاتے ہیں اور جیپ سے سر نکال کر ایسے دیکھتے ہیں، جیسے سیدھے سگریٹ کے اشتہار سے نکل کر کوئی شخص جیپ میں سوار ہو گیا ہو اور اسٹرنگ پر ہاتھ رکھا لیا ہو۔

●●

کرنا کیا ہے؟''

نیل کنٹھ چاروں طرف گھوم رہے ہیں۔ تناؤ سے پہلے ہی انہیں علم ہو گیا تھا معاملہ زیادہ گڑ بڑ ہونے کو ہے۔

کرفیو میں تھوڑی ڈھیل ہوئی تو سیدھے نریندر کے یہاں پہنچ گئے۔

بالمکند شرما دروازے کی آڑ لے کر کھڑے تھے۔

جیپ سے اتر آیا نیل کنٹھ —

''سلام چاچا—''

بالمکند نے صرف ہاتھ اٹھایا۔ یہ آدمی کبھی انہیں پسند نہیں آیا۔

بولتا ہے تو لگتا ہے کہ کبھی شرافت کا منہ ہی نہ دیکھا ہوگا۔ صرف کرتا پائجامہ چڑھا لینے سے کیا ہوتا ہے۔ انہیں لوگوں نے تو کرتے پائجامے کی عزت اتار لی۔

نیل کنٹھ پریشان ہوتا ہے۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے چاچا جی۔''

''یہ حالات رہیں گے تو طبیعت کس کی ٹھیک رہے گی۔''

نیل کنٹھ کوئی تبصرہ نہیں کرتا۔

''نریندر ہے؟''

''ہاں اندر ہے۔''

''اچھا چاچا جی، ذرا نریندر کو دیکھنے آیا تھا۔''

مسکرانے کی کوشش کرتے ہیں بالمکند شرما جوش، مگر مسکرا نہیں پاتے۔ نیل کنٹھ تیزی سے اندر گھستا ہے۔

''نریندر......او......نریندر......

نریندر ڈرائنگ روم میں مل جاتا ہے۔

''بیٹھو۔''

صوفے پر اوما اور نیل کی پتنی تلسی بیٹھی ہے۔ چپ چاپ۔

''نمستے بھابی۔''

نیل کنٹھ دونوں کو ہاتھ جوڑتا ہے...... پھر ہنس کر کہتا ہے۔

''ارے سب کے چہرے اترے ہوئے کیوں ہیں۔ ارے بھائی ہنگامے سے آپ لوگوں کو مطلب ہی کیا ہے۔ اتنی چپی کیوں ہے...... ارے میاں بھائی اپنی اوقات میں رہتے، ملک کو ملک سمجھتے تو یہ سب نہیں ہوتا، کیوں تلسی بھابی۔''

تلسی کے پتی انیل کانگریس کے کاریہ کرتا ہیں۔ 'سکریہ' تو نہیں ہیں۔ پھر بھی کانگریس کی ایکٹیویٹیز میں برابر کے شریک رہتے ہیں۔ کانگریس پارٹی سے ان کے پاس خط، دعوتی کارڈ وغیرہ سب آتے رہتے ہیں۔

تلسی نیل کنٹھ کی بات پر منہ بسورتی ہے۔

''پتہ نہیں، راجنیتی کی بات تو آپ ان سے ہی کیجئے گا۔''

''ارے ان سے کہہ کر شہید ہونا ہے۔'' نیل کنٹھ زور زور سے ہنستا ہے۔ ہم بولیں گے ایک بھابی تو انیل بھیا سنائیں گے دس۔ ہم ٹھہرے بھاجپا کے وہ ٹھہرے کانگریسی۔

تلسی کے چہرے پر تھوڑی سی رونق آ گئی۔ جنتا دل ہوتا تو گٹھ جوڑ بھی ہوتا۔''

''ارے ایک بار تو گٹھ جوڑ ہوا ہی تھا۔''

''نتیجہ کیا نکلا۔ تم نے لنگی ماردی—''، تلسی پھر سنجیدہ ہوگئی۔ چھوڑو مجھے راج نیتی نہیں آتی۔

نیل کنٹھ نریندر کی طرف مڑا۔' کیوں نریندر؟ تم اتنا چپ کیوں ہو؟'

اس نے ایک ولز سلگا کر پھر ہونٹ سے لگا دیا۔

''کچھ نہیں۔''

پریشان ہو؟''

''نہیں۔''

''پھر کیا ہے؟''

''یار— چپ بھی نہیں رہ سکتا کیا؟''

''اوہ چپ کا روزہ رکھا ہے کیا۔ پھر ٹھیک ہے۔ چلتا ہوں۔ لیکن ایک بات بتانی ہے۔''

نریندر کھنکھارا۔

نیل کنٹھ چپ ہوا۔ نریندر نے اوما کو آنکھوں سے اشارہ کیا۔ تلسی اور اوما دونوں اٹھ کر باہر چلے گئے۔

''کیا ہے؟''

''تم کو تو معلوم ہے۔ ہم سب پر سنکٹ آیا ہوا ہے۔''

''ہاں۔''

''تم کو اطلاع دینے آیا ہوں۔ کچھ دن ہونٹ سی کر بیٹھ۔ کاریالیوں، دفتروں میں پولیس چھاپے مار رہی ہے۔ کچھ دن کے لیے ہمیں انڈر گراؤنڈ ہونا ہوگا۔ یہ سب بین لگنے کی وجہ سے ہے۔''

''ہونہہ—''

نریندر کو فکر تھی۔ نریندر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

''پارٹی دفتر سے ضروری کاغذات ہٹا لیے گئے ہیں۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ لیکن......''

اس نے ایک بار پھر زور دیا......

''کچھ دنوں کیلئے ہمیں انڈر گراؤنڈ ہو جانے کی ضرورت ہے......اچھا چلتا ہوں۔''

''چائے تو پی کر جا۔''

''نہیں۔ پھر کبھی۔''

نیل کنٹھ تیزی سے اٹھا، باہر آیا، تب بھی مالکمند شرما جوش دیوار سے ویسے ہی ٹیک لگائے کھڑے تھے۔

''اچھا چلتا ہوں چاچا جی۔''

نیل کنٹھ جیپ میں بیٹھ گیا جیپ اسٹارٹ ہوگئی۔

گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی تھی۔ شمیم کا روتے روتے برا حال تھا۔ جمیلہ کے بھی صبر کا باندھ ٹوٹ گیا تھا......

صبح ہوگئی، لیکن منا نہیں آیا۔

دل میں رہ رہ کر دھڑ کا ہو رہا تھا۔ چودھری برکت حسین رہ رہ سجدے میں گرے جا رہے تھے...... اللہ بری خبر سے بچائیو اللہ...... پروردگار...... معبود...... بری خبر سے محفوظ رکھیو اللہ۔ میرے معبود، میرے رب۔

''سنیے جی!''

آنسو پونچھتی جمیلہ دروازے پر کھڑی ہے...... ''کچھ کیجیے گا؟ باہر شور سا ہے۔ کرفیو ختم ہو گیا لگتا ہے......آپ دیکھیے نا...... باہر جائیے نا...... کچھ کیجیے نا۔''

''کیا کروں؟''

جیسے برسوں کے بیمار ہو گئے ہوں برکت حسین۔ آنکھیں جل تھل...... کلیجہ میں تپاک۔ باہر آئے...... معلوم ہوا دو گھنٹے کے لیے کرفیو میں ڈھیل دی گئی ہے۔ لوگ سبزیاں اور ضرورت کے سامان خریدنے کے لیے دوڑ پڑے تھے۔

''کہاں رہ گیا۔ ایسا تو نہیں کرنا چاہئے تھا۔ موسم خراب، زمانہ خراب، گھر میں بیوی بچے— پہلے سوچا کہ پاس میں گیا ہو...... بجلی آفس میں کسی سے لڑائی بھی کی تھی، بات بات پر بگڑ جاتا تھا— مزاج کا بھی تیز تھا۔ آج کے لڑکے۔ اچھا برا دیکھتے نہیں۔ اور بے بات بگڑ جاتے ہیں۔ کسی نے کہیں مار کر......''

بری بات سوچتے ہی دل کی دھڑکن بڑھ جاتی تھی۔

●●

قریب کی پولیس چوکی۔

چودھری برکت حسین نے ٹوپی برابر کی۔ اندر گھسنا چاہا تو سپاہی نے روک دیا۔

''کیا ہے؟''

''ایف آئی آر درج کرانی ہے۔''

''کیسی ایف آئی آر؟''

''میرا لڑکا کل رات سے گھر واپس نہیں آیا۔''

سپاہی نے منہ پچکایا— بڑے میاں کے حلیے کو دیکھا۔ سر پر دو پلی ٹوپی۔ شیروانی کرتا، شیروانی پر جگہ جگہ لگے پان کے دھبے۔ منہ چلتا ہوا۔ یعنی پان کی گلوری دبی ہوئی۔ پریشان حال۔ قد لانبا اور پوری طرح سے پرانے زمانے کے نوابوں کی یاد دلاتی ہوئی شخصیت۔

''کل رات سے نہیں آیا—؟' سپاہی نے دہرایا۔ کسی نے مار کر پھینک دیا ہوگا—''

وہ لڑکھڑا گئے۔

سپاہی اندر گیا۔ باہر آکر ان کو گھور کر دیکھا۔

''جاؤ صاحب بلا رہے ہیں۔''

وہ اندر داخل ہوئے۔ اندر بیٹھا پولیس افسر فائل میں کھویا رہا۔ انہوں نے گلہ کھکھار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ اس نے بغیر دیکھے ہاتھ کے اشارے سے سامنے والی کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا۔

وہ بیٹھ گئے۔

ذرا دیر کے بعد انسپکٹر نے سر اٹھایا۔
''کیا ہے؟''
''میرا لڑکا کل سے غائب ہے۔''
''نام کیا ہے؟''
''منا۔''
''عمر؟''
''۳۵ سال......''
انسپکٹر چونکا۔''اور نام منا ہے۔''
''یہ تو پکارنے کا نام ہے۔''
''اصل نام کیا ہے اور کرتا کیا ہے؟''
''تنویر حسین۔بجلی آفس میں کلرک ہے۔''
''ہونہہ—''
انسپکٹر نے ہونکاری بھری۔کچھ سوچ میں ڈوب گیا۔پھر بولا۔
''کیا کہا کل سے غائب؟ یعنی کرفیو والی رات سے۔''
''ہاں۔''
''کچھ کہہ کر گیا تھا؟''
''نہیں۔''
''کسی کی طبیعت خراب تھی؟''
''نہیں۔''
''کسی سے کچھ کہہ کر نہیں گیا۔کسی کی طبیعت خراب بھی نہیں۔پھر کرفیو والی رات کیوں گیا۔آپ نے سمجھایا نہیں کہ باہر نکلنا منع ہے۔''
چودھری برکت حسین کو اس غیر ضروری جرح سے الجھن ہوگئی۔خود پر رونا آ گیا بولے۔
''نئے بچے ماں باپ کی اتنی ہی قدر کرتے تو پھر میں آپ کے پاس ہی کیوں آتا؟''
''آپ کو کوئی شک ہے؟''
''شک کس پر ہوگا۔''
''منا کا کوئی دوست۔''
''میں نہیں جانتا۔ویسے تھا اکھڑ طبیعت کا آدمی۔گھر پر بھی کوئی ملنے نہیں آتا تھا۔''
''آپ کیا چاہتے ہیں۔؟''
برکت حسین کو پھر رونا آیا۔''آپ پوچھ رہے ہیں۔میں کیا چاہوں گا۔میرا لڑکا غائب ہے،ایک بوڑھا باپ ایسے میں کیا چاہ سکتا ہے۔''
انسپکٹر نے بڑے میاں کو گھور کر دیکھا۔
''محلّہ کون سا ہے آپ کا۔''
''کھیم پور۔''
''جی!''

وہ ایک دم سے چونک گئے۔

انسپکٹر مسکرایا۔' آتنک وادی تو نہیں ہے۔'

وہ پھر لڑکھڑا گئے۔

''چونکتے کیا ہیں۔خبر ملی ہے کہ علی پور، کھیم پور اور زیادہ تر محلے کے مسلمان لوگ یہی کرر ہے ہیں۔آپ کا لڑکا اگر مارا جاتا تو اس کی لاش ہم کو ضرور ملتی۔کل رات سے ہمارے پاس کسی لاش کے ملنے کی سوچنا نہیں آئی ہے۔آئے گی تو آپ کو خبر کریں گے۔آپ پتہ لکھ جائیے۔''

''اور ایف آئی آر؟''

''جانکی ایف آئی آر لکھتا ہے۔جانکی نہیں ہے۔جائیے، گھر واپس جائیے۔''

انسپکٹر پھر فائل دیکھنے لگتا ہے۔

دماغ میں آندھیاں چھوٹ رہی تھیں۔

(۵)

اتنا بڑا شہر — کہاں گیا ہوگا منا؟

منا ان کے لیے اب بھی وہی چھوٹا سا منا تھا۔کچھ بھی نہیں بھولے تھے......اس کی شرارتیں، کھیل کود — سب کچھ یاد تھا — منتوں اور دعاؤں سے کھلا پھول تھا، تنویر حسین — بچپن سے ہی ضدی، ہٹی، پڑھنے میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔شوق تھا، تو ان چیزوں کا، خاندان کی کسی پشت میں جس کا شوق نہیں رہا — گلی ڈنڈا، کانچ کی گولیاں، اور گلی کے آوارہ چھوکرے۔وہ پکڑ پکڑ کر گھر میں لاتے طمانچوں سے خیر مقدم کرتے۔خاندان کا واسطہ دیتے......اچھے برے کی تمیز سکھاتے بچپن سے ہی جو صحبت بگڑی تو زبان خراب ہوگئی۔منا کی۔اسکول میں بھی کبھی اچھا ریزلٹ نہیں کیا۔ہمیشہ شکایت ہی آتی رہی۔یہ کر دیا، وہ کر دیا، کسی کی کاپی گم کر دی، کسی کی کتاب پھاڑ دی۔

سچ ہے کہ آوارگی چہرے سے بھی بولنے لگتی ہے یا چہرے پر اس کے آثار آ جاتے ہیں، یہ خیال تھا چودھری برکت حسین کا۔منا کے چہرے پر کہیں سے بھی وہ پرانا خاندانی پن موجود نہیں تھا۔پہلے یہ خاندانی پن چہرے چہرے سے جھلکتا تھا۔اب وقت کے ساتھ جھلکتا ہی نہیں کہ کون کیا ہے۔کتنے پانی میں ہے کبھی کبھی وہ سوچتے بھی ہیں، چلو اب اس کی ضرورت ہی کیا ہے پھر اس خیال کو کچلنے کے لیے کتنے ہی خیال ہاتھیوں کی فوج کی طرح آگے بڑھ جاتے ہیں۔

ضرورت ہے میاں برکت حسین......ضرورت ہے۔یہ سب ڈھونگی باتیں ہیں برابری کی پیسہ لاکھ ہو جائے مگر انسان وہی رہے گا جو اس کے خون میں ہے۔خاندانی آدمی غریب سے غریب ہو جائے پر آن نہیں جائے گی۔یہ خوبی ہے۔

چلو، چھوڑو، وہ خود کو سمجھاتے ہیں۔وقت آگے بڑھ گیا ہے......اور یہ جو وقت ہے، یہ وقت ان کے وقت سے دیگر ہے۔یہ صرف خاندانی ڈھکوسلوں میں نہیں جیتا ہے۔یہ وقت عملی آدمیوں کا ہے۔یعنی پیسہ کس کی پکڑ میں کیسے آتا ہے۔اب ایسی باتیں جیسی کہ وہ سوچتے ہیں۔کسی کے پاس اس طرح کی باتیں سوچنے کی فرصت بھی نہیں......

چھوڑو یار، برکت حسین...... نئے زمانے کو بھی دیکھ رہے ہو۔کیا یہ کم ہے — نئی نئی چیزیں آ گئی ہیں۔آسائش کے نئے نئے سامان۔تمہارے وقت میں یہ سب کہاں تھے — لڑنے مرنے کے جدید ماڈل کے اسلحے۔موت کتنی آسان ہوگئی ہے۔موت سب سے آسان ہوگئی ہے۔

کیا منا کو بھی موت لے گئی......؟

ابھی کرفیو میں ڈھیل ہے...... پورے گھنٹے بھر باقی ہیں......

بالمکند شرما جوش کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں......

''جوش صاحب تشریف رکھتے ہیں......''

عام دنوں کی طرح آواز میں وہ جوش نہیں ہے۔ ہانپنے لگتے ہیں...... پن ڈبہ گھر پر رہ گیا۔ جیب میں ہاتھ ڈالنے کے بعد ٹھہر جاتے ہیں......

جوش صاحب......!

دروازے پر نریندر کھڑا ہے۔

''آیئے چچا جان۔ پتا جی اس طرف ہیں۔''

نریندر اشارہ کرتا ہے......وہ سہمے سہمے سے کمرے میں داخل ہورہے ہیں۔ چہرہ پیلا پڑا ہوا ہے۔

بالمکند چونکتے ہیں۔

''کیا ہوا ہے برکت حسین؟''

''منا کل سے غائب ہے۔''

''کیا—'' نریندر زور سے چونکا۔

''گھر نہیں آیا۔'' بالمکند کی آنکھوں میں تشویش ہے۔

''شمیم اور جمیلہ دونوں کا روتے روتے برا حال ہے۔کل تو کرفیو لگا تھا۔ پگلا بغیر کہے رات میں جانے کہاں چلا گیا۔''

''کسی سے کچھ ناراضگی ہوئی کیا۔''

''نہیں۔''

''پھر کہاں چلا گیا۔''

''خدا معلوم۔اسی واسطے تو طبیعت پریشان ہے۔''

''کل سے نہیں آیا۔ بات تو واقعی تشویش کی ہے۔''

بالمکند نے نریندر کی طرف دیکھا۔

''کیا کرنا چاہیئے؟''

''آپ نے ایف آئی آر درج کرائی چچا جان۔''

''رپورٹ لکھوانے گیا تھا۔''

''پھر؟''

''رپورٹ نہیں لکھی۔انسپکٹر نے کہا کہ جو رپورٹ لکھتا ہے وہ ہے نہیں۔''

''یہ سب ان کی بدمعاشی ہے۔''

نریندر دھیرے لہجے میں بدبدایا۔

''دیکھا—'' بالمکند شرما جوش غصے میں نریندر کی طرف مڑے۔دیکھا تماشہ۔اب یہی ہوگا— منا غائب ہے۔یہی ہوگا اب اور یہ سب کرا رہی ہے تمہاری پارٹی۔''

''ہماری پارٹی کیوں کرا رہی ہے۔''

نریندر کی آنکھوں میں خفگی ہے۔

''نریندر۔اور کس کی پارٹی کرا رہی ہے۔زبردستی کے بند۔اتہاس کی قبر کھود کر گڑے مردے نکالنا— گڑے مردے نکال کر لوگوں کو

بھڑکانا۔اخبارات،ریڈیو،ٹی وی سب تمہاری پارٹی کرارہی ہے۔''

''دیکھیے پتاجی۔غصہ ہونا ہےتو جی بھر کر غصہ ہو لیجئے۔لیکن اس طرح چچا جان کے سامنے بےعزت نہ کیجئے۔ابھی فی الحال میں کچھ نہیں کہہ پاؤں گا۔''

''کہو گے کیاتم؟''

بالمکند شرما جوش کانپ رہے تھے۔

نریندر برکت حسین کی طرف مڑے۔ پتاجی کی طبیعت ان دنوں ناساز ہے۔آپ گھبرائیے نہیں۔ میں رپورٹ لکھوا کرآتا ہوں۔ چلیے میرے ساتھ......'

''کیا......''

''میرے ساتھ چلئے''

بالمکند پھر بڑبڑائے۔اچھا تماشہ ہے۔زخم بھی دواور مرہم بھی بھرو۔ارے کسے بیوقوف بنارہے ہوتم......سب تمہاری پارٹی......زہر سے کام نہیں چلےگا توSweet pioson(میٹھا زہر)دینے میں بھی استاد ہےتمہاری پارٹی......اب یہی ہوگا۔

'نریندر کمرے سے باہر نکل گیا۔

بالمکند دیرتک غصے میں بڑبڑاتے رہے۔

●●

کرفیو کا اعلان پھر ہو گیا تھا۔

علی پور،بہشتی ٹولہ،اکبر پورہ،دالان والی مسجد،محلّہ قریش اوراس طرح کے دیگر محلوں میں آگ زنی اور چھرا مارنے کے واقعات دوبارہ ہوگئے تھے۔ یہ سب کرفیو کی ڈھیل کا کرشمہ تھا— بوکھلائے ہوئے لوگوں میں زہر اب ابھی موجود تھا۔اور کچھ زہر تو لوکل اخباروں نے بھر رکھا تھا۔جنہیں بکنے اورعوامی مقبولیت حاصل کرنے کے لیے یہی وقت ملتا ہے۔

پولیس کی گشت پھر جاری تھی۔سائرن کی آواز اور پی اے سی کے بوٹوں کی گونج پھر سڑکوں پر سنائی دینے لگی تھی۔

●●

شام کے چھ بجے برکت حسین کے دروازے پر پولیس کی جیپ رکی۔ دہی صبح والا انسپکٹر تھا۔وہ تیزی سے اتر کر صحن پار کر کے دروازے کی طرف بڑھا۔

برکت حسین بھاگے بھاگے آئے۔

''کوئی بری خبر تو نہیں ہے بھائی؟''

ان کا کلیجہ زور زور سے کانپ رہا تھا—

''بری خبر،ابھی نہیں کہہ سکتا۔شہر کے جنگلی علاقے میں ہمیں ایک لاوارث لاش ملی ہے۔وہ لاش چوکی میں آگئی ہے۔ہم وہی آپ کو دکھانا چاہتے ہیں۔''

کمرے کے اندر چیخ کر شمیم کے گرنے کی آواز آتی ہے۔

برکت حسین لرزتے قدموں سے جیپ میں بیٹھ گئے۔

جیپ روانہ ہوگئی—

نیل کنٹھ کو خبر ملی تھی، پولیس امر جیت کو گرفتار کر کے لے گئی ہے۔شہر میں ہونے والے تناؤ میں اس کی بھی بھومیکا پرمکھ رہی ہے۔
تناؤ اب بھی تھا۔کرفیو میں دو دو گھنٹے کی ڈھیل صبح شام مل جاتی تو جیسے عام زندگی روزمرہ کی خرید وفروخت میں جٹ جاتی۔مگر تناؤ لگا تار بنا ہوا تھا۔پولیس کے جتھے ابھی بھی چاروں طرف چھترائے ہوئے تھے۔امر جیت کی جیپ کے آگے پریس لکھا ہوا تھا ایک اخبار کا پریس کارڈ بھی تھا اس کے پاس۔

نیل کنٹھ جب امر جیت سے ملنے گیا تو وہ گھر ہی تھا ڈرائنگ روم میں نلکانی کے علاوہ پارٹی کے دیگر لوگ بھی جمع تھے۔
نلکانی مٹھائی کے ڈبے سے مٹھائی نکال نکال کر بیٹھے ہوئے لوگوں کو کھلا رہا تھا۔
نیل کنٹھ نے مسکرا کر پوچھا۔''میں نے تو سمجھا تھا کہ آپ جیل میں ہوں گے۔ یہاں مٹھائیاں بٹ رہی ہیں۔''
''چلو تم بھی منہ میٹھا کرو۔''
''مگر کس خوشی میں؟''
''ارے دیکھتے نہیں۔ ہماری پارٹی بس جیت کا اتہاس لکھنے ہی والی ہے۔''
نیل کنٹھ ،ہنس پڑا۔نلکانی نے مٹھائی کا ایک بڑا سا ٹکڑا اس کے منہ میں ٹھونس دیا—
امر جیت نے نعرہ لگایا......''جے شری رام''
کمرے میں سب ایک جٹ ہو کر سر ملا کر بولے''جے شری رام۔''
امر جیت مسکرایا— ''چاروں طرف ہماری وجے پتا کا پھہرا رہی ہے سب رام کی کرپا ہے۔ اب ہماری پارٹی رہے گی، ہم ہوں گے......اور ہوگا ہمارا اکھنڈ بھارت ورش......''
نلکانی نے آگے بڑھ کر صوفے کے کنارے میز پر رکھا ہوا ٹیپ آن کر دیا۔ یہ ٹیپ اس نے اجودھیا سے خریدا تھا۔ سیتا رسوئی کے پاس والی دکان سے پولیس چوکی کے پاس بیٹھا ہوا سپاہی بھی ان گانوں کی دھن سنتے ہوئے خود کو جھومنے سے نہیں روک سکا تھا۔اسے اچھی طرح یاد تھا۔
کمرے میں ٹیپ بجنے لگا......مندر وہیں بنے گا......
''جے شری رام''
نیل کنٹھ نے اس بار زور سے کہا۔سب یک مشت بولے۔ جے شری رام۔
ٹھہر کر ملکانی بولا،سنکیت اچھے مل رہے ہیں۔ چاروں اور سے اچھی خبریں آرہی ہیں۔ہم پر جتنا انکش یا پرتیبندھ لگایا جا رہا ہے،اس کا لابھ ہم کو مل رہا ہے۔سماچار پتر ہوں یا دوردرشن، وے جتنا ہمارے وِرودھ بول رہے ہیں اس سے کانگریس کو کوئی لابھ نہیں۔کانگریس کی امیج زخمی ہوئی ہے۔مسلمان بھی کانگریس کے ورودھ ہو گئے ہیں اور پرتیکریا سروپ ہم پہلے سے ادھک مضبوط ہو گئے ہیں۔جن سنگھ کے بعد اب تک کے اتہاس میں یہ پہلی بار ہے جب ہم اتنی جن چیتنا عام ہندوؤں میں جگا پانے میں کامیاب رہے ہیں اور یہی میری سب سے بڑی اپلبدھی اور سفلتا ہے۔ جب جن سنگھ تھی تب یاد ہوگا ہم نے گئو ہتیا کو روکنے کا ابھیان چلایا تھا۔اس سمے بھی ہندو جنتا کا ہمیں سمرتھن پراپت ہوا تھا۔ پرنتو اتنا بڑا سمرتھن ہمارے حصے میں پہلی بار آیا ہے اور یہ سمرتھن، یہ جن چیتنا اوشیہ ہمیں پاور مارگ تک لے جائے گی۔
''پاور مارگ'' اس نے اس لفظ پر زور دیا۔ بچوں اور مہیلاؤں سے لے کر عام بدھی جیوی ورگ تک سب ہمارے ساتھ ہیں۔ ہاں کچھ لوگ ابھی بھی خوش فہمی کے راستے جی رہے ہیں۔ جو سیکولر سیکولر چلاتے ہیں اور دھرم نرپیکچھتا کی بات کرتے ہیں۔ وے بھی جان رہے ہیں کہ اب یہ ابھیان روک پانا ان کے لیے آسان نہیں ہے۔ کم وبیش وے بھی ہمارے ہی ساتھ ہیں، پرنتو کھل کر ان کو سامنے آنے میں آپتی ہے۔

ایسے لوگ ہمارے لیے گھاتک بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو چاہئے کہ اپنا رویہ اسپشٹ کریں کہ وے اس کروٹ ہیں یا اس کروٹ۔ بھوش میں اگر پارٹی ان سے خطرہ محسوس کرتی ہے تو ہمیں ایسے لوگوں کے وِرودھ بھی اٹھنا ہوگا لیکن کشل راجنیتی سے ایسے لوگ دومونہا سانپ ہوتے ہیں انہیں توڑنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن ہم انہیں بھی اپنے پکچھ میں لانے کا ہر سمبھو پریتن کریں گے۔''

ہمارے اصل ہتھیار رہوں گے بچے اور مہیلائیں — مہیلاؤں سے گھر گرہستی چلتی ہے بچوں کا دماغ نازک ہوتا ہے اور جلد سچ کو سویکار نے کی چھمتا رکھتا ہے۔ مہیلاؤں اور بچوں کو اپنے پکچھ میں کرنے کا مطلب ہے ایسے لوگوں کو سویم اپنے بس میں کرنا — اور وہ ہم کریں گے — فی الحال آپ کے لیے ایک سوچنا ہے۔

نلکانی ٹھہر کر بولا۔'' پارٹی دفتر کو پولیس نے سیل کر دیا ہے۔ لیکن جلد ہی ہم کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ نکالیں گے۔''

امرجیت نے پاس پڑا ہوا اخبار آگے کیا...... 'دیکھو ہمارے نیتا علیم بخت نے ایک — کانفرنس میں کتنی اچھی بات کہی ہے۔ وہ زور زور سے اخبار پڑھ کر سنانے لگا۔

''میں اپنے بارے میں سوچتا ہوں کہ اگر اس ملک کی ۸۰ فیصد آبادی ہندو نہ ہوتی تو میرا کیا ہوتا۔ اگر یہ ملک ہندوؤں کا نہ ہوتا تو علیم بخت کا وہی حشر ہوتا، جو پاکستان میں کسی رام لعل کا ہوتا ہے۔ جہاں رام لعل اپنے حقوق کی بات ہی نہیں کر سکتا، اپنی آواز نہیں اٹھا سکتا، اپنے کو رام لعل تک نہیں کہہ سکتا۔

۱۹۴۷ میں پاکستان کا اسلامی راشٹر گھوشت ہو جانا جائز تھا تو ہندستان کا ہندو راشٹر گھوشت ہو جانا ناجائز کیوں ہے۔ لیکن اس وقت بھی ہندستان ہندو راشٹر نہیں بنا۔ ۸۰ فیصد جنتا کے ہندو ہوتے ہوئے یہ قربانی ہندو جنتا ہی دے سکتی ہے اور وہ لوگ جو اس ملک کے بٹوارے کے ذمہ دار ہیں، سیاست کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں نہیں دی جا سکتی۔ سچائی یہ ہے کہ ہندو کبھی ہنسک نہیں ہو سکتا ہندو اہنسا کا ہی دوسرا نام ہے۔

امرجیت چپ ہوا تو کافی تالیاں پڑیں۔

ایک ممبر نے کہا — ''دھرم نرپیکچھتا کی مثال یہ ہے۔ ہمارے بخت صاحب۔''

دوسرے نے کہا — ''کیا خوب اور کھری کھری بات کی ہے۔ یہ ہیں سچے مسلمان۔''

نلکانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں مسلمانوں سے نفرت نہیں ہے۔ مسلمان کو ہم بھارت کا ہی حصہ سمجھتے ہیں۔ اور اگر ہماری پارٹی ستہ میں آ جاتی ہے تو ہم مسلمانوں کو پورن سرکچھا دیں گے۔''

امرجیت ٹھہر کر بولے، ''مسلمانوں کے دل میں ہمارے لیے جو گھرنا بھاؤ آ گیا ہے، ہمیں اسے دھوڈالنا ہے — ہمیں ان کے بیچ جا کر پریم اور سد بھاؤنا کی بات کرنی ہے۔''

نلکانی آگے بولا — ''اوپر سے حکم ہوا ہے — ہمارے یہاں مسلم پرتی ندھی کتنے ہیں؟ اور حیرت کی بات ہے کہ ہم یدھ استر پر کام کر رہے ہیں۔ لیکن ایک بھی مسلم پرتی ندھی نہیں بنا پائے ہیں۔ یہ شرم کی بات ہے۔''

'پرتیندھی مل جائے گا۔'

لوگوں نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ پارٹی کے ایک ممبر تھے۔ سدھنید وبابو۔ دبلے پتلے۔ لمبے۔ زیادہ تر کرتا اور دھوتی پہنتے تھے۔

''مل جائے گا۔''

''ہاں۔ ایک ویکتی ہمارے پاس ہے۔ مسلمان ہے۔ دو دن پہلے بے ہوش اوستھا میں ہمیں ملا تھا۔ حالت نازک تھی۔ ہم نے اسپتال میں بھرتی کروا دیا۔''

''لیکن آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ بھاجپا میں وہ شامل بھی ہو سکتا ہے۔''

''آج صبح میری اس سے بات چیت ہوئی۔ وہ کچھ ٹھیک تھا۔ لیکن ڈاکٹر نے بستر سے اٹھنے کی ممانعت کر رکھی ہے۔ یہ جان کر کہ ہم بھاجپا

کے ہیں۔اس نے خود ہی شامل ہونے کی بات چھیڑی۔''

امرجیت اورنلکانی نے ایک دوسرے کوگھور کر دیکھا۔'کوئی ویکتی آ کرخود سے پہل کرے تو اس کا کیا مطلب ہوگا؟''

''ہمارے لیے کوئی شدینتر بھی تو ہوسکتا ہے۔''

''کیسی بات کررہے ہو، کیا پورے دیش میں پارٹی کا۔نیتر تو کرنے والے مسلم پرتی ندھیوں کی کمی ہے۔ہمارے یہاں نہیں ہے۔تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ مسلم ہماری پارٹی میں آنا ہی نہیں چاہتے۔''

''ہاں یہ ہے۔''

نلکانی نے سوچتے ہوئے کہا— ''خود بخت صاحب ہیں، قاسم صاحب ہیں...... جونیتر تو کرر ہے ہیں۔اور یہ بھی ہوسکتا ہے جومسلمان آنا چاہ رہے ہوں وہ اپنے سماج اور اپنے معاشرے سے کٹنے کی وجہ سے یا کاٹ دیئے جانے کی وجہ سے پرتی رودھ کا شکار ہوں۔لیکن آسکتے ہیں۔یہ سوال ہمارے لیے ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کی طرح ہے۔'

امرجیت نے کہا۔''مسلمان بھائی ہماری پارٹی جوائن کرنا چاہیں تو ان کے لیے ہمارے دروازے کھلے ہیں۔''

نیل کنٹھ نے بولنا چاہا۔'لیکن ہمارا کھل کر مسلمانوں کے لیے ورودھ بھرے شبد بولنا؟ اپنی دھرم ورودھی پارٹی کو کوئی کیسے اپنا سکتا ہے؟''

'یہیں پر تو ہمیں ایک تیر سے دوشکار کرنے ہیں۔' نلکانی سنجیدہ ہوئے۔راجنیتی میں سب چلتا ہے۔ہمیں ورودھ میں بھی بولنا ہے اور مسلمانوں کو پھسلائے بھی رکھنا ہے یعنی دونوں طرح کے سماچار میدان میں اتارنے ہیں۔تا کہ ان کی بھیتری اتھل پتھل میں ہمارے لیے ایک Soft corner بھی بن جائے۔

امرجیت نے کہا،''آخر اتنے دنوں بعد ہماری پارٹی ایک بڑی پارٹی کے روپ میں ابھری ہے۔کل ہم ستا میں بھی آئیں گے۔مسلمان اس سچ کو کسی حد تک سویکار کرنے لگے ہیں۔وے اس ڈر کو کم کرنا چاہتے ہیں۔اور واستو میں ان میں سے کچھ بھاجپا میں آنے کا راستہ دیکھ رہے ہیں۔''

''اس ویکتی سے کیا بات ہوئی آپ کی۔''

'زیادہ بولنا چالنا تو منع ہے۔اس نے کیول اتنا کہا کہ وہ بھاجپا میں دل چسپی رکھتا ہے۔

نلکانی بولا۔''تو پھر ٹھیک ہے۔ہم اس ویکتی سے بات کریں گے......نام کیا ہے؟''

سدھیندو بابو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''اس ویکتی نے اپنا نام تنویر حسین عرف منا بتایا ہے۔''

(۷)

منا لوٹ آیا۔

منا چپ چاپ لوٹ آیا۔نہ کسی سے کچھ کہا نہ سنا۔یہ بھی عجیب بات تھی کہ ان دو دنوں میں چودھری برکت حسین کا چوکی سے تین بار بلاوا آچکا تھا۔اور وہ بھی کس سلسلے میں......لاوارث لاش دیکھنے کے لیے......جن کے وارث نہیں مل رہے تھے اور چودھری برکت حسین کو شناخت کرنی تھی کہ یہ ان کا منا ہے یا نہیں۔

پہلی بار تو سچ مچ چکرا گئے تھے برکت حسین۔

جب پولیس جیپ کے ساتھ وہ انجان لاش کو شناخت کرنے کے چوکی میں گئے تھے۔سفید کپڑے سے ڈھکی ہوئی لاش پڑی تھی۔اور ان سے پوچھا جا رہا تھا—

''پہچانو کیا یہی تمہارا منا ہے......''

منا!

اندر جیسے توپیں گرج رہی تھیں۔ بوڑھے لاچار باپ کے نصیب میں کیا اب یہ بھی لکھا ہے کہ وہ اپنے مرحوم بچے کی لاش کو سہارا دے۔ برا ہوا کرے۔ پر ہے تو اپنا خون — لاش پڑی ہے......اور ایک عجیب سا خوف کپکپی بن کر ان کے پورے وجود میں اتر گیا ہے......

برکت حسین......اگر یہ منا ہوا تو؟

آنکھوں کے آگے گہرا اندھیرا چھاتا جا رہا تھا......

ڈرتے کانپتے ہاتھوں سے سر کے پاس کی چادر دھیرے سے ہٹائی پھر فوراً ڈھک دی......

''نہیں۔''

ایک مضبوط اور مطمئن آواز...... یہ میرا منا نہیں ہے۔

وہ گھر واپس آ گئے تھے۔

●●

اس کے بعد بھی تھانے سے دو بار بلاوا آیا۔ چلیے لاش کی پہچان کرنی ہے۔

جمیلہ بگڑتی تھی۔ ''زندہ لوگوں کی کھوج نہیں کرواتے یہ مردود۔ مردوں کی پہچان کرواتے ہیں — آپ کا دل ایسے بھی کمزور ہے۔ آپ مت جائیے۔ منا لوٹ آئے گا — میرا دل کہتا ہے۔''

اور سچ مچ ماں کے دل میں یہ تاثیر تو ہے جو بچے کے اچھے برے خبر کی گندھ خواب خیال میں سونگھ لیتی ہے — پتہ چل جاتا ہے — ہاں شمیم کسی کو کوسنے دیتی تو جمیلہ چلاتی۔

''چپ کر......وہ لوٹ آئے گا۔ کسی مصیبت میں ہے، مگر لوٹ آئے گا۔''

●●

اور منا لوٹ آیا۔

دوپہر کا وقت۔ شدید دھوپ چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ کرفیو اٹھا لیا گیا تھا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے اس نے اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

جو پہلی صورت دروازے پر نظر آئی وہ گود میں نشی لیے شمیم تھی۔

شمیم چیخ مار کر منا سے لپٹ گئی۔

لیکن یہ کیا۔ منا چپ تھا جیسے اندھیری گلی میں بھوتوں کو دیکھ لیا ہو۔ گم سم...... جمیلہ بھاگتی ہوئی آئی۔

''خیریت تو ہے؟''

چودھری برکت حسین کمرے سے باہر نکل آئے۔

''کہاں چلا گیا تھا — ؟''

پھر سب منا کو گھیر کر بیٹھ گئے۔ منا بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں گھور رہا تھا۔

''کہاں چلا گیا تھا۔'' برکت حسین چیخے۔

جمیلہ ملائمیت سے بولی۔ 'دیکھتے نہیں ابھی طبیعت ٹھیک نہیں۔ بہو پانی لانا۔'

شمیم جھٹ دوڑ کر گلاس میں پانی لے آئی — منا نے ایک سانس میں پانی ختم کر دیا۔

''کہاں گیا تھا میرے لال؟''

برکت حسین اس کے چہرے کے زخمی اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہے تھے۔ یا خدا...... یہ چپی، یہ خاموشی...... کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ تو نہیں۔

منا چپ تھا۔ آنکھیں گھر کے افراد کو نہیں گھور رہی تھیں...... گھور رہی تھیں چھت کو...... خلاء میں دیکھ رہی تھیں۔ ان میں کوئی تاثر نہ تھا۔ نہ کوئی جذبات، نہ احساسات۔

بے رنگی تھی، پتھر ہو جانے جیسی کیفیت تھی۔ سامنے والے کو پتھر بنا دینے والی مضبوطی تھی۔

''کچھ بولتے کیوں نہیں۔''

چودھری برکت حسین نے آگے بڑھ بڑھ کر اسے جھنجھوڑا — پاگل ہو گئے ہو، ہوش کھو بیٹھے ہو۔ کہاں چلے گئے تھے۔ اس طرح اچانک۔ بتایا تو ہوتا۔ بیوی تھی۔ بچے تھے۔ ہمارا خیال نہ کیا ہوتا، ان کا کیا ہوتا۔ ٹھیک تھے۔ تو خبر بھجوائی ہوتی۔ ارے کچھ تو کیا ہوتا۔ میاں تم کیا جانو...... ان دو دنوں میں کیا کیا افتاد ہم پر گزر گئی۔ کیا کچھ نہ سہا۔ کیسی کیسی باتیں سوچ لیں۔ تھانے رپورٹ لکھوائی۔ اب ایک بار پھر وہاں جا کر لکھوانا ہوگا کہ تم زندہ لوٹ آئے۔ وہ پوچھیں گے کہاں رہے اتنے دن؟ تب بھی بولنا تو ہوگا۔

''مجھے تنہا چھوڑ دیجئے۔''

منا نے منہ بنا کر کافی دیر پر جملہ ادا کیا۔

''کیوں —؟''

''میں نے کہا نا۔ مجھے ابھی کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔''

''لیکن کہاں چلا گیا تھا۔ اچانک چپ چاپ۔''

''آپ لوگ کیوں میری جان کے پیچھے پڑے ہیں۔''

منا کی لرزتی آواز پر جیسے سب چپ ہو گئے۔

برکت حسین نے گھوم کر جمیلہ کو دیکھا۔ اشارہ کیا۔

''جاؤ — منا کو آرام کرنے دو۔''

شمیم اب بھی رو رہی تھی۔ ''میری قسمت پھوٹ گئی — انہیں کیا ہو گیا ہے۔ میری بچی کا کیا ہوگا؟''

منا چپ چاپ مڑ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ماحول میں کرفیو جیسا سناٹا پھیل گیا۔

تنہا کمرہ...... خاموش کمرہ...... کبھی کبھی کمرہ بولتا ہے...... اور ہم سانپ کے ڈسنے سے دہلتے رہتے ہیں...... کبھی کبھی کمرہ وہ ہیبت طاری کرتا ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں...... خود کا حساب لیتا ہے کمرہ...... جرح کرتا ہے، دلیلیں دیتا ہے...... سوال کرتا ہے...... لتاڑتا ہے...... اور زخمی کرتا ہے......

اور ابھی — اس وقت — جرح، دلیلوں اور سوالوں کی ترنگوں میں تنویر حسین عرف منا کھویا ہوا تھا۔

یہ سب کیا ہو گیا؟

کیسے ہو گیا؟

تم نے اچانک ہار کیسے مان لی؟

وہ جرح میں کسی وکیل کی طرح الجھتا۔ بڑے لوگوں کو قائد بنا کر دیکھ لیا۔ وہ صرف کٹھ پتلی ثابت ہوئے۔ عام سی کٹھ پتلی۔ بے جان — وہ دبتے ہیں یا سمجھوتہ کرتے ہیں......''

''تو تم بھی سمجھوتہ کر رہے ہو؟''

''یہ سمجھوتہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک کڑوا سچ جو سامنے ہے' اس سے خود کو باہر نکالنے اور بچانے کا ایک راستہ ہے۔

''تو کیا اس کے لیے؟''

''ہماری پہنچ اگر ان تک نہیں ہوگی تو پارلیامنٹ میں ہماری آواز کی گونج تک نہ ہوگی۔''

''نیتا بننا چاہتے ہو منا؟''

کمرہ ہنستا ہے......بجلی آفس کی کلرکی کے بعد اب نیتا گیری کا نمبر ہے۔ بہت بڑا خواب لے کر جی رہے ہو۔ مسلمانوں کی نمائندگی کی بات کرر ہے ہو۔ ان مسلم نیتاؤں سے جی بھر گیا کیا؟

''ہاں سب سے جی بھر گیا۔ وہ خود مرنے کے لیے سامنے نہیں آتے۔ ہمیں مرواتے ہیں۔ ہمیں سامنے کرتے ہیں۔ ہم پر گولیاں چلواتے ہیں۔ سب کو دیکھ لیا۔''

''اس لیے اب خود نیتا بننا چاہتے ہو......''

''میں نیتا کہاں بن رہا ہوں۔ میں صرف برے دن سے واپسی چاہتا ہوں۔ جو خبریں مل رہی ہیں اس سے نجات چاہتا ہوں......اور اس کے لیے ضروری ہے کہ — کل میری بچی بڑی ہوگی — کیا وہ محفوظ ہوگی؟ کون محفوظ ہوگا — میں تو صرف اپنی شرکت چاہتا ہوں کہ وہ سمجھیں کہ ہم کیڑے مکوڑے نہیں ہیں۔ ہم ان میں بھی شامل ہیں۔''

''لیکن اس شرکت سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا۔ تم کون سا ذلیل ہونے سے بچ جاؤ گے —؟''

کوئی آواز سر نکالتی ہے۔ تم قاسم بنو گے یا علیم بخت کی بھومیکا نبھاؤ گے تو مسلمانوں کے درمیان سے کاٹ دیئے جاؤ گے۔ خود اپنے گھر سے تمہارا وہشکار ہوگا —'

آواز بار بار شب خوں مارتی ہے......خیر چھوڑو......ہوا کیا تھا میاں تنویر حسین......تم اچانک چلے کہاں گئے تھے......؟

اس رات......

تنویر حسین کے لب پتھر ہو گئے تھے۔

●●

کرفیو والی رات سے چار دن پہلے

افیم والی کوٹھی کے شوکت میاں کے یہاں آس پڑوس کے چار پانچ لوگ بیٹھے تھے۔ ان میں تنویر حسین بھی تھا۔

معاملہ وہی تھا۔ اگر کچھ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔؟

کسی نے کہا۔ اکبر پورا، کھیم پور، علی پور، بہشتی ٹولہ وغیرہ محلوں میں مسلمانوں کی صورتحال زیادہ بھیانک نہیں ہے — اس لیے کہ ان محلوں میں مسلمان اچھی خاصی تعداد میں ہیں۔ ایک تو حملہ ہوگا ہی نہیں......اور دوسرا؟''

''دوسرا کیا؟''

بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک آدمی نے اعتراض کیا۔ ''ہم میں حملہ کرنے یا حملہ کا جواب دینے کی ہمت ہے؟ پہلے یہ بتائیے۔''

شوکت میاں بولے۔ مسلمان اکثریت والے محلوں کے بارے میں یہ سوچنا کہ یہاں کچھ نہیں ہوگا۔ سراسر بے بنیاد ہے۔ جبکہ اصلیت یہ ہے کہ یہ سامپردائیک جماعتیں ایسے ہی محلوں کو پہلے اپنا نشانہ بناتی ہیں۔ اور مسلمانوں کے پاس ہے کیا، ہتھیار کے روپ میں؟

''اگر وہ حملہ کرتے ہیں تو جواب دینے کے لیے ہمارے پاس لاٹھیوں کے سوا اور کچھ ہوگا بھی نہیں۔''

اور تازہ صورت حال یہ ہے کہ وہ مسلمانوں پر حملہ کرنے کی یوجنا بنا رہے ہیں۔

''فضا خراب ہے کسی بھی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

''اور طے ہے کہ کچھ بھی ہوا تو مسلمان ہی مارے جائیں گے۔''

''اسی لیے — شوکت میاں نے خوف سے سہمے چہروں کو پڑھا — آپ نے سنا ہوگا۔ کئی محلوں میں بم بنائے جا رہے ہیں۔ گپ چپ

یہ کام زوروں پر ہو رہا ہے۔ ہم بھی یہ کام کریں گے۔''

انہوں نے ایک طرف کونے میں بیٹھے ہوئے شریف بھائی کو اشارہ کیا۔

''یہ شریف بھائی ہیں۔ اکبر پورا میں رہتے ہیں۔ سلائی کا کاروبار ہے۔ یہ سکھائیں گے آپ کو بم بنانا۔''

منا نے مسکرا کر دیکھا شریف بھائی کو —

شریف بھائی ۴۰۔۴۵ کی عمر کے ہوں گے — سنجیدہ آدمی...... وہ اٹک اٹک کر بولے...... جمانا نا جک ہے...... برے وقت کے لیے مسلمانوں کو تیار رہنا چاہئے —''

''لیکن سیکھنا کہاں ہوگا۔''

''یہیں آجایئے گا —''

شوکت بھائی نے منا کو دیکھا — میاں کلیم پور کی صورت حال سب سے زیادہ نازک ہے۔ جب سے اس چھونڑے رگھو کی ہتیا ہوئی ہے، بھاجپا کے لوگ اس ہتھیا کو سمپر دائیک رنگ دے رہے ہیں۔

منا کی آنکھیں پھیل گئیں...... گھر...... ابا...... اماں...... شمو...... نشی...... ایک نظر میں بے بس اور لاچار یہ سارے نظر میں گھوم گئے......

''خطرہ تصور سے زیادہ ہے۔''

منا نے پلٹ کر پوچھا — 'میں کب سے سیکھنے لگوں۔'

''ابھی اسی وخت۔''

شریف بھائی مسکرائے، پھر گھر جا کر چوری چھپے بنانا مت بھولیے گا۔

''کلیم پورہ کی حالت نازک ہے، منا کو اب اس کے علاوہ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا —''

یوں دنگوں کی چھٹ پٹ ریہرسل ہوتی رہی تھی۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ اچانک اتنی جلدی صورت اس حد تک نازک ہو جائے گی — اتنی جلد دنگے کی پرشٹھ بھومی تیار ہو جائے گی کہ سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔

جمعہ کے روز ویسے بھی کلیم پور میں صبح سے اس بات کی چرچا تھی کہ آج کچھ ہو کر رہے گا —

●●

منا صبح میں پان کی دکان پر تھا۔ پان کی دوکان پر آپس میں کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے۔

''چارٹرک باہر سے آدمی بلائے گئے ہیں۔''

''چارٹرک؟''

پھر جیسے اس سے کچھ سنا نہیں گیا۔ گھر میں آ کر بت بن گیا۔ لگا سر پر ایک خونی تلوار لٹک رہی ہے۔ منا کو لگا ابھی مشتعل لوگ آئیں گے، پورے گھر میں آگ لگا دیں گے، سب مارے جائیں گے۔

اس دن منا نے بجلی آفس سے بھی چھٹی کر لی — جمعہ کی نماز پڑھنے بھی نہیں گیا۔ ہاں دروازے کے باہر جہاں اس نے کرائے پر دو دکانیں دے رکھی تھیں ان کے پاس چلا آیا۔ یہ کرایہ دار بھی مسلمان تھے۔ اور گیارہ بجے کے آس پاس ہی دکان بند کر کے چلے گئے تھے ساڑھے گیارہ بجے کے آس پاس اس نے دیکھا بہت سی دکانوں کے شٹر گر گئے۔ جمعہ کی نماز کا وقت قریب آ رہا تھا۔ سڑک پر انسانوں سے زیادہ پولیس نظر آ رہی تھی۔ پی اے سی کے جوانوں کے جتھے بندوق اور ہرڈل اٹھائے ایک طرف جاتے دکھائی دئے۔

'اگر کچھ ہو گیا تو؟''

منا کے سامنے بس یہی سوال تھا۔ ان کے یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ شوکت میاں کے یہاں ہے...... کیا اسے وہاں جانا چاہئے — اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ سڑک پر بھاگم بھاگ اور پولیس دوڑ شروع ہو گئی۔ ساڑھے بارہ بجے اور ڈیڑھ بجے کے درمیان واقعات نے دنگوں کا لباس

پہن لیا۔

شہر میں کرفیو لگ گیا۔

منا بار بار اس خیال کی سطح پر تھا کہ کرفیو سے کیا ہوتا ہے......ان کی پلاننگ ہے تو وہ آئیں گے۔ مسلمانوں پر حملہ کریں گے......وہ تو مقابلہ بھی نہیں کر سکیں گے۔ حملہ کے لیے مناسب وقت تو رات ہے......اور پھر پولیس تو خود ان کے ساتھ ہے۔

''لیکن کرفیو میں؟''

پھر اسے کرفیو کا خیال آیا — اسپتال کا بہانہ بنا دے گا۔ ماں سخت بیمار ہے — کچھ ناٹک کرے گا —

سچ تھا کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ وہ بغیر کسی کو کچھ بتائے چپ چاپ باہر نکل گیا۔

●●

کھیم پور سے تو وہ چپ چاپ باہر نکل گیا۔ چپل کی آواز بھی شور کر رہی تھی۔

کھیم پور اور پلوا سے کراس کرتے ہی نالے کے ادھر شو پوری کا علاقہ ہے۔ ادھر کرفیو نہیں تھا۔ شو پوری ہو کر ہی افیم والی کوٹھی جایا جا سکتا تھا۔ شو پوری میں ڈم، مدھم روشنی میں ایک پان کی دکان کے پاس کچھ لوگ کھڑے تھے۔

پھر اسے کچھ نہیں معلوم —

اس کے سر پر کسی نے ڈنڈے سے وار کیا۔ وہ چکرا کر گر گیا......

جب ہوش آیا تو وہ ڈاکٹر نریندر کی کلینک میں تھا۔ اور سدھیند ورائے اس پر جھکے ہوئے تھے......

●●

یہ اتفاق تھا کہ سدھیند ورائے اپنی سائیکل سے نالہ کراس کر رہے تھے۔ انہوں نے زخمی حالت میں گرے ہوئے منا کو دیکھا۔ پھر کسی طرح اس کے اسپتال لے جانے کے بارے میں سوچا۔ مگر اچانک خیال آیا کہ ذرا دور پر ان کے ڈاکٹر دوست اور پارٹی کے کاریہ کرتا ڈاکٹر نریندر رہتے ہیں۔

سدھیند ورائے زخمی منا کو ڈاکٹر نریندر کی پرائیویٹ کلینک میں لے گئے۔ پولیس میں رپورٹ جان بوجھ کر نہیں لکھوائی گئی کہ پولیس ایسے میں مصیبت کھڑی کر سکتی تھی۔

چوٹ شدید تھی۔ منا کو ہوش تو آ گیا لیکن سر پھٹا جا رہا تھا۔ اچانک اسے سب کچھ یاد آ گیا — کرفیو، اس کا باہر نکلنا، ٹھیک اسی وقت اس کے کانوں میں ہلکی سی صدا سنائی پڑی۔ ''جے شری رام......''

دھندلے سے دو خاکے تھے جو باتیں کر رہے تھے۔ یہ ڈاکٹر نریندر راو اور سدھیند ورائے تھے۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر سدھیند ورے لپک کر گئے۔

''کیسے ہو؟''

اس نے سر پر ہاتھ رکھا، جیسے دماغ کی ساری نس کڑکڑا رہی ہو۔

''ابھی تو تم بہتر نہیں ہو۔ لیٹے رہو۔'' ڈاکٹر نریندر مسکرا کر آگے بڑھے۔

''کس محلے کے ہو —؟''

''کھیم پور''

سر میں تیز چنک ہو رہی تھی۔

''نام —''

اس نے بیٹھتے ہوئے سر کو تھامتے ہوئے بتایا۔

’’تنویر حسین۔‘‘

’’مسلمان ہے—‘‘

ڈاکٹر نریندر مسکرا کر سدھیند ورائے سے بولے۔

●●

دوسرے دن صبح میں ڈاکٹر نریندر خود اس کے پاس چائے کا طشت لیکر پہنچے۔سدھیند ورائے پہلے سے ہی ٹیبل پر بیٹھے تھے۔

’’مارننگ!‘‘ ڈاکٹر نریندر مسکرائے۔’’اب کیسے ہو؟‘‘

’’بہتر ہوں۔لیکن سر اب بھی پھٹ رہا ہے۔‘‘

’’باہر کرفیو لگا ہے۔گھر کوئی میسج بھجوانا ہے......‘‘

’’ہاں۔‘‘ کہتے کہتے وہ ٹھہر گیا......نیم بے ہوشی اس پر طاری ہو رہی تھی......

’’ابھی طبیعت پوری طرح درست نہیں ہوئی۔جتنی چوٹ دماغ پر پڑی تھی، وہ اچھے اچھوں کے ہوش اڑانے کے لیے کافی ہے۔دماغ کی نس پھٹ سکتی تھی۔یادداشت گم ہو سکتی تھی۔‘‘

’’بہتر ہے اسے ابھی تم اپنی نگرانی میں رکھو۔‘‘

ڈاکٹر نریندر اور سدھیند ورائے پھر پارٹی اور کاریہ کرموں کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔

منا کو عجیب سا لگا— کیا اس پارٹی میں بھی اچھے لوگ موجود ہیں......سدھیند ورائے نے اس کی جان بچائی۔ڈاکٹر اس کی خیریت پوچھنے آتا ہے۔مفت علاج کر رہا ہے......

اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔دماغ اب بھی پھٹ رہا تھا۔غنودگی اسے بوجھل کر رہی تھی۔

دوپہر میں اس کی طبیعت ذرا ٹھیک لگی تو اس نے سدھیند ورائے سے پوچھا۔

’’آپ بھاجپائی ہیں؟‘‘

یہ سوال ایسا تھا جسے پولیس مجرم سے پوچھتی ہے...... بتاؤ، تم مجرم ہو......تم نے قتل کیا ہے۔

’’ہاں۔ہوں تو؟‘‘

’’لگتے نہیں—‘‘

سدھیند ورائے ہنسے۔’تم کیا سمجھتے ہو، بھاجپائیوں کو سینگ ہوتی ہے؟‘

وہ ہنس پڑا—

’’سینگ نہیں۔پھر بھی۔‘‘

’’ظالم کا تصور ہوگا تمہارے پاس۔‘‘

وہ چپ رہا—

’’سب بکواس‘‘ سدھیند ورائے مسکرائے۔’’ہماری پارٹی کو ناحق بدنام کیا گیا ہے—انسانوں کی عام نظر میں جو قدر اور عزت ہے۔وہی معاملہ ہماری پارٹی کے ساتھ ہے—اب بتاؤ کیا ہم تمہیں جنگلی اور دنگائی لگتے ہیں؟‘‘

’’نہیں—‘‘

’’ارے جو دنگا کرتے ہیں وہ بھی تو آدمی ہوتے ہیں۔مصلحت پسند اور سیاسی۔‘‘

’’آپ نہیں ہیں۔‘‘ منا کو خود یہ حیرت تھی۔

’’بالکل نہیں— ہم تو ایک بات کہہ رہے ہیں اور بات اگر سہی ہے تو اس پر ڈٹے رہنا اور دکھانا ہی کام رہ جاتا ہے— سیاسی کھلواڑ تو

دوسرے لوگ کر رہے ہیں—''

سدھیند ورائے کو کچھ خیال آیا۔

''شام میں تمہارے محلے میں دو گھنٹے کی ڈھیل ہے۔ گھر جانا چاہو یا خبر بھجوانا تو...... ویسے خبر بھجوا سکتے ہو۔ ابھی تمہاری طبیعت زیادہ ٹھیک نہیں۔ اس لیے آج بھر آرام کرلو۔ اور گھر خبر بھجوا دو۔''

''نہیں—''

اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔

''کیوں۔ اچانک جا کر سرپرائز دوگے''

وہ بس آہستہ سے مسکرایا۔

''آج آرام کرلو۔ کل صبح ہی تمہارا نام کٹوا دیں گے۔ اب تم بہتر ہو۔''

''شکریہ۔''

منا کو لگ رہا تھا...... ستا اب ان سے زیادہ دور نہیں ہے...... یہ چاروں طرف چھترا چکے ہیں...... ہر جگہ...... ہر محاذ پر...... ان سے فرار ناممکن ہے......

یہ سوال پہلے بھی اس کے دل میں کوندا تھا...... جب وہ حکومت میں آ ہی رہے ہیں تو پھر کیا کرنا چاہئے۔ دل کے کسی کونے سے آواز اٹھی تھی...... ہمیں بھی ان کی پارٹی جوائن کر لینی چاہئے......

لیکن......

اور اس لیکن کے دائرے سے باہر شک وشبہات کی بارودی لائن بچھی تھی...... لیکن ایک خطرہ اور بھی تھا کہ اگر پارٹی حکومت سنبھال لیتی ہے اور مسلمان اس سے کٹے کٹے رہتے ہیں تو پھر انہیں اپنے حقوق سے بھی ہاتھ دھونا ہوگا......

منا کے چھوٹے سے دماغ میں یہ بات آ گئی تھی......

اس نے سدھیند ورائے سے پوچھا۔

''ایک بات پوچھوں۔''

''ضرور''

''میں آپ کی پارٹی جوائن کرنا چاہتا ہوں۔''

●●

''کیسا ہوا ہے۔ کچھ بولتے کیوں ہیں آپ؟''

دروازے پر گود میں نشی کو لیے شمیم کھڑی ہے۔

اور دنوں کی طرح غصہ نہیں آیا شمو پر۔ ڈانٹا نہیں۔ بگڑے نہیں۔ نشی کو گود میں لے لیا۔

نشی گود میں آتے ہی بلکنے لگی۔

شمیم نے آنکھوں میں اتر ہوئے آنسو کو پونچھا۔ ''آپ نے سب کو رلا دیا۔''

منا نے ایک اچٹتی سی نظر شمیم پر ڈالی...... سب کچھ وہی ہے...... گھر...... کمرہ...... شمو...... اماں...... صرف وہ بدل گیا ہے...... وہ شمو کی طرف مڑا۔ آواز میں رکھائی شامل تھی۔

''کھانا لگا دو۔ بھوک لگی ہے—''

(۸)

’جوش صاحب...... بالمکند شرما جوش صاحب......تشریف رکھتے ہیں۔؟‘

چودھری برکت حسین نے دروازے پر کھڑے کھڑے آواز لگائی۔ آواز لگا کر جیب سے پن ڈبہ نکالا۔ پن ڈبہ سے پان کی ایک گلوری نکالی۔ منہ میں ڈال کر چباتے رہے......اندر سے نقاہت میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔

’’کون ہے بھائی...... برکت...... برکت حسین‘

دروازے پر جوش صاحب کھڑے ہیں......ارے آؤ بھائی......اندر آجاؤ......‘

کمرے میں چپی ہے۔ کافی دنوں بعد مل رہے ہیں دونوں ایک دوسرے سے — بیچ میں صرف ایک دن منا کے غائب ہونے پر برکت حسین بالمکند سے ملنے آئے تھے......پھر فضا ہی ایسی رہی کہ کوئی کسی سے کیا ملے......

’’یہ سب کیا ہو رہا ہے بالمکند؟‘‘

برکت حسین کی آواز کانپ رہی ہے۔

’’یہ ہو رہا ہے برکت حسین کہ تم سے نظریں ملاتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے۔‘‘

’’واقعات نے کہیں کا رہنے نہیں دیا۔ ایک دیوار تقسیم نے کھڑی کر دی تھی۔ اس دیوار کو توڑنے میں برسوں لگے......اب یہ نئی دیوار...... اب تو جان ہی جائے گی......ہم کہاں رہیں گے —؟‘‘

’’ہونہہ......‘‘

برکت حسین پیک تھوکنے کے لیے اگالدان ڈھونڈتے ہیں۔ ہاتھوں کو حرکت دیتے ہوئے دیکھ کر جوش صاحب طنز کرتے ہیں......

’’میاں بدل رہے ہو۔ اتنے دن میں بدل گئے تم۔ میاں برکت حسین۔ ذرا ان دیواروں پر نظر ڈالیے...... پان کے سرخ نشانات، جہاں بھی نظر آرہے ہیں، سب آپ ہی کی رہینِ منت تو ہیں۔ پھر یہ اگالدان کیوں ڈھونڈا جا رہا ہے؟‘‘

’’وہ......‘‘

ہنستے ہوئے برکت حسین پیک دیوار پر تھوک دیتے ہیں......’’ہاں سچ کہتے ہو‘

سب کچھ بدل رہا ہے...... بدلنا پڑ رہا ہے میاں جوش......کبھی کبھی ان دوستوں پر رشک آتا ہے جو ہم سے پہلے دنیا کا ساتھ چھوڑ گئے۔ کم از کم یہ برے دن دیکھنے سے بچ گئے نا......‘‘

جوش صاحب ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں......’’برے دن...... جو ہو رہا ہے......اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو لگتا ہے......اس سے بھی برے دن آنے والے ہیں، اتنے برے دن جن کے تصور بھی نہیں کئے ہوں گے ہم نے۔‘‘

’’ارے چھوڑو میاں...... چلو ایک بازی ہو جائے شطرنج کی۔‘‘

جوش صاحب نے شطرنج تو نکال لیا۔ لیکن آنکھیں بساط سے زیادہ پچھلے دنوں ہوئے واقعات کے محاسبے میں پھنسی رہیں۔

مہرہ چلتے ہوئے برکت حسین بولے۔ ’منا تو آ گیا ہے، لیکن بدلا بدلا سا ہے۔‘

’’کچھ بتایا نہیں میاں کہ کہاں گیا تھا۔‘‘

’’نہیں پولیس کے پوچھنے پر بتا دیا کہ کرفیو کی وجہ سے ایک دوست کے یہاں ٹھہر گیا تھا۔‘‘

’’تم نے گم سم رہنے کی وجہ پوچھی؟‘‘

’’کچھ بولتا ہی نہیں۔ گم سم چپ چاپ سوچتا رہتا ہے۔‘‘

’’پھر بھی پوچھنا تو چاہئے تھا کہ اچانک کہاں چلا گیا تھا۔‘‘

''اب کیا فائدہ جوش میاں۔لیکن جو ہوا ہے،اچھا نہیں ہوا ہے۔''

برکت حسین مہرے گرا دیتے ہیں......'اچھا چلتا ہوں جوش میاں۔آج کھیل میں بھی دل نہیں لگا۔ پہلے سوچا تھا کچھ دیر بیٹھوں گا۔دل بہلاؤں گا۔مگر......خدا حافظ......''

برکت حسین چلے گئے......

جوش صاحب کے اندر کوئی آواز حرکت کرتی ہے......

''...... یہ دنیا جیسی ہے ویسی ہی رہے گی۔ بالمکند شرما جوش تمہارے کہنے سے نہیں بدلے گی اوراس دنیا میں تم جیسوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔''

وہ تیز تیز چلتے ہوئے کھلے میں آجاتے ہیں......دماغ پر لگا تار کوئی ہتھوڑے برسا رہا ہے......

''یہ سب......میاں بالمکند شرما جوش......تم ایک مرتی ہوئی صدی کا تماشہ دیکھنے کے لیے زندہ ہو۔اپنے گھر میں ہی کس پر ادھیکار ہے تمہارا؟اپنے بچوں پر......؟''

ایک گھٹی ہوئی سانس چھوڑتے ہیں وہ......

''میرے بچے کہاں ہیں...... یہ تو بھاجپائی ہیں یا کانگریسی۔یہ میرے بچے نہیں ہیں۔''

آواز کی دھمک سر پر مستقل بنی ہوئی تھی۔

حیرت گاہ

(۱)

فضا شانت ہوگئی۔

لیکن کیا سچ مچ فضا شانت ہوئی تھی؟

ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا تھا کہ کرفیو ختم کر دیا گیا۔ مگر نکڑوں پر مسجد اور مندر کے چوراہوں پر، چوک پر جیسے پولیس چوکی بیٹھی تھی اور سچ پوچھئے تو فضا ویسی ہی بارودی تھی، جیسے کچھ دنوں پہلے کی ریہرسل کے دوران تھی۔ ڈر اور خوف لوگوں کے دلوں میں برابر بیٹھا ہوا تھا۔

اس بیچ تلاشی کا سلسلہ شروع ہوا— پولیس نے اچانک گھروں میں گھس کر ریڈ کرنا شروع کیا۔ کھیم پور کے علاوہ اکبر پورہ اور قریش محلّہ کے کئی لوگوں کی گرفتاری عمل میں آئی۔

اس دن اچانک پولیس نے چودھری برکت حسین کے یہاں ریڈ کر دیا۔

دروازہ کھولو—

منا گھر پر تھا۔ دروازہ کھول دیا۔

پولیس کے سپاہی دندناتے ہوئے آگے بڑھ آئے۔ ایک نے آگے بڑھ کر منا سے بدتمیزی کے انداز میں کہا۔

''بم کہاں ہے میاں جی؟''

''تمیز سے بات کرو۔''

منا بپھرا تو پولیس کے ایک سپاہی نے ڈنڈے سے منا کو زور سے ٹھیلا۔

''سالے پولیس سے جبان لڑاتا ہے۔''

منا اڑ گیا— ''آپ تلاشی نہیں لے سکتے۔''

ایک سپاہی دوسرے سپاہی سے کہہ رہا تھا...... ''سالے سب پاکستان سے ملے ہوئے ہیں۔''

منا نے کچھ بولنا چاہا تو ایک سپاہی نے زور سے کہا...... ''چپ...... ہمیں آرڈر ملا ہے۔''

پھر دیر تک اس آرڈر کی تعمیل ہوتی رہی...... چیزیں پھسکارتی رہیں۔

چودھری برکت حسین سہمے سہمے سے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔

ایک سپاہی ان کے پاس آ کر مذاقیہ انداز میں بولا۔ ''بم بنانا آپ سکھاتے ہو بابا جی—''

بابا جی وہ ایسے لہجے میں بولا تھا کہ دوسرے سپاہی ہنس پڑے۔ اندر تلاشی کے بعد باقی دو سپاہی لوٹ آئے تھے۔

''چلو۔ یہاں سے کچھ نہیں ملا۔''

''چلو۔''

کڑیل مونچھوں والے سپاہی نے پلٹ کر برکت حسین سے پوچھا۔

''بابا یہاں کوئی تہہ خانہ تو نہیں۔ سچ سچ بتایئے۔ ورنہ اگلوانا تو ہم جانتے ہی ہیں......''

''ارے چلو یار۔''

دوسرے سپاہی نے اسے کھینچا۔

جمیلہ اور شمیم بری طرح سے کانپ رہی تھیں۔ یہ تو خیر تھا کہ سپاہیوں نے خواتین کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی......منا اندر ہی اندر تاؤ کھا رہا تھا...... یہ سب......یعنی حد ہوگئی ہے— ظلم کی انتہا کر دی ہے سالوں نے......

لیکن وہ تو......

کیا وہ مانیں گے اگر اس نے بتانا بھی چاہا تو......وہ کوئی پبلک فیگر تھوڑا ہے۔ اس نے تو بس دور اندیشی کی ایک چال چلی ہے۔ یہ چال غلط بھی ہوسکتی ہے۔ مگر—

منا نے پکڑ کر شمو کو ڈانٹا۔

کوئی بھی آتا ہے تو تم لوگ اندر کیوں چلی آتی ہو۔ کوئی شرم وحیا نہیں ہے۔ پولیس والے بدتمیزی سے پیش آئے تو......''

''ایسے ہی بدتمیزی سے پیش آتے، منہ نہ نوچ لیتی۔''

جمیلہ نے بہو کا ساتھ دیا۔

چودھری برکت حسین کے منہ میں جیسے تار لگ گیا تھا......ایسی بے عزتی پولیس والا کس درجہ بدتمیزی سے ان سے پیش آ رہا تھا۔ انگریزوں کا زمانہ ہوتا تو چلو کوئی بات ہوتی۔ غیر ہیں— ظلم کر رہے ہیں۔ غلامی ہے۔ اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے پاپڑ بھی بیلنے پڑتے ہیں۔ گولیاں بھی کھانی پڑتی ہیں اور گالی بھی۔ مگر یہاں......

اپنے ہی وطن واسیوں سے یہ ذلت...... یہ ذلت ان کے لیے ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ وہ کس قدر بے بس تھے۔ کتنے لاچار...... انہیں لگتا ہے...... پولیس کی طاقت دنوں دن بڑھتی جا رہی ہے......اور پولیس میں......فوج میں......مسلمانوں کے لیے انتقام اور نفرت کا جذبہ بھی بڑھتا پھیلتا جا رہا ہے...... برسوں کی پرانی کہانی......میل ملاپ کے تاریخی قصے انہی قصوں کو تو دہراتے ہیں بالمکند شرما جوش......

یا برکت حسین نئے بچوں سے پوچھو تو غالب واقبال کے نام پر بغلیں جھانکیں۔ کون ہیں یہ؟ میری پوتی مالو پوچھتی ہے......ددو...... آپ مسلمان ہیں کیا......آپ اردو پڑھتے ہیں......اردو— مسلمان— بچے بھی پوچھتے ہیں مجھ سے۔ آخر مسلمانوں سے کیا ہمدردی ہے۔ مجھے کیوں ان کا پکچھ لیتا ہوں— ان کے بارے میں برا کیوں سننا نہیں چاہتا۔ اس کا الٹا جواب بھی ہوسکتا ہے کہ میاں ہمدردی نہیں ہونے کی وجہ کیا ہے۔ اور ان کے بارے میں برا کیوں سننا چاہوں گا— میاں، جب برسوں سے مدتوں سے رہنا سہنا ایک ساتھ ایک طرح سے ہوا ہے تو پھر ان سے خود کو کاٹنے کی بات کیسے سوچوں برکت حسین— اب تو ہم تم جسم کے ایک ٹکڑے ہی لگتے ہو۔ تمہیں تکلیف ہوتی ہے تو دل پر چوٹ پہنچتی ہے۔ بچے اس درد کو نہیں سمجھتے۔ بچے اردو اور مسلمان جانتے ہیں— بچے نیا اتہاس اور نیا سبق جانتے ہیں......کل تو سارے کام اردو میں ہوتے تھے۔ ابا حضور کی قابلیت تو فارسی میں بھی دیکھتے بنتی تھی۔ اس سچ کو ہم کیسے جھٹلا دیں کہ میاں زبان کی چاشنی دیکھنی ہو تو اردو کے دامن میں اتر کر دیکھو۔ نہیں برکت حسین میاں بچے اپنے زمانے کے اتار چڑھاؤ کو زبان جانتے ہیں۔ ہمارے تمہارے درد کو نہیں سمجھتے۔''

برکت حسین آہ کھینچتے ہیں...... بالمکند جوش میاں......تم سچ کہتے ہو......ہم اردو بولتے ہیں۔ اس لیے ہم اس ملک کے تیسرے درجے کے شہری ہیں انہیں حق حاصل ہے کہ ہمیں خوفزدہ کر کے ہمارے گھر کی تلاشی لے سکتے ہیں۔ قانون قاعدے اب ہمارے لیے نہیں رہے جوش میاں......لگتا ہے...... دھیرے دھیرے مسلمانوں کے لیے ملک کی تہذیب اور سیکولر تہذیب کے طور طریقے سب اٹھتے جا رہے

ہیں......اس لیے اب اگر منا بگڑتا ہے کہ آپ کل پاکستان کیوں نہیں چلے گئے......تو اسے جواب دیئے نہیں بنتا یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہاں کون سے خوش ہو تم......وہاں بھی مدتوں برسوں رہ کر اردو بول کر مہاجر ہی کہلا رہے ہو تم......تم بلوچی ہو، سندھی، پٹھان ہو......مگر مسلمان کہاں ہو...... پاکستان میں کون سا مارکاٹ کم ہے۔ جو وہاں جاتا......کون سی خوشی ہے وہاں مگر جوش میاں......جس ملک پر ناز تھا، اس کے باسیوں اور فوج نے ہم پرانے لوگوں کو زخمی کر دیا ہے......'

●●

احساس اور جذبات کی موجیں ہلچل پہ آئیں تو آنکھیں بھر آئیں۔ کارنس سے اتار کر شیروانی پہنی۔ لاٹھی تھامی۔

منا نے آواز لگائی۔

'کہاں چلے؟'

''اور کہاں جا سکتا ہوں؟''

اس کی آواز نرم تھی ''جایئے مگر جلد لوٹ آیئے گا۔''

●●

انیل کافی دنوں بعد ٹکرایا تھا—انہوں نے غور سے انیل کو دیکھا۔ انیل آگے بڑھا۔ چرن چھوئے انہوں نے آشیرواد دیا۔

''جگ جگ جیو۔ چاند سا بیٹا ہوئے۔''

''اسی آسرے پر تو جی رہا ہوں چاچا۔ دیکھئے بھگوان کو ہماری خوشی کب منظور ہوتی ہے۔''

''ناامید کیوں ہوتے ہو۔؟''

''ناامید نہیں ہوتا چاچا۔ لیکن کبھی کبھی لگتا ہے، سارے دکھوں کے لیے کیا اکیلے ہم ہی رہ گئے ہیں۔''

''سارے دکھ؟''

برکت حسین چونک گئے—

''اب آپ سے کیا کہوں چاچا...... ایک دکھ تو بچے کا ہے۔ تلسی کی جان الگ کھلتی جا رہی ہے......اور اس پر ملک کا حشر......ان بھاجپائیوں پر تو غصہ آتا ہے۔ صرف حکومت کی چاہ......اور چاروں طرف آگ بھڑک رہی ہے۔''

''چھوڑو بیٹا ان باتوں کو...... کچھ دوسری باتیں کرو'

انیل کے چہرے پر بل پڑ گئے۔ اب اس دیش میں کچھ دوسری باتیں بھی ہیں۔ چاچا آنکھوں کے سامنے دیش ٹوٹ رہا ہے۔ عام ویکتی کو سامپردائیکتا کا زہر کھاتا جا رہا ہے......وہ ہماری آپس کی مثالی ایکتا سے کھیل رہے ہیں۔ اب دوسری باتیں کون سی ہیں چاچا'

برکت حسین نے اسے غور سے دیکھا۔ بچپن میں گودوں کھلایا تھا اب سیاسی زبان میں نیتاؤں والی بھاشا میں بات کر رہا تھا۔

''آج کل پارٹی میں زیادہ آنا جانا لگتا ہے۔''

''زیادہ کیا ہے بس پہلے پریس کے کام سے جاتا تھا۔ اب راجنیتی میں تھوڑا بہت مزہ ملنے لگا ہے۔

انیل نے ٹھہر کر پوچھا۔ لیکن آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں چاچا—

برکت حسین نے گہری سانس بھری۔ پھر کم سے کم لفظوں میں تلاشی اور پولیس کی بدتمیزی کی داستان بتا دی۔

انیل طیش کھا گیا۔

''منا نے مارا کیوں نہیں؟''

''کیسے مارتا—جان سے جانا تھا کیا؟''

''آپ نہیں جانتے چاچا۔ ان کی طاقت بڑھتی جا رہی ہے۔ ان کے حوصلے بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔''

''تو تمہاری پارٹی کیا کر رہی ہے۔''

''ہم کیا کر سکتے ہیں۔انہوں نے مدعا ہی ایسا اٹھایا ہے— جے شری رام جیسے اب صرف ان کی جھولی میں ہیں۔ہم سے کوئی واسطہ نہیں۔عام آدمی بیچارا تو نا سمجھ ہے۔وہ یہی سمجھتا ہے، یہ مندر بنا رہے ہیں تو یہی صحیح ہیں۔''

'اس کا مطلب تم بھی سمجھتے ہو کہ یہ پاور میں آسکتے ہیں۔'

''نہیں۔لیکن ان کی طاقت کا بھی اندازہ ہے۔یعنی یہ آ بھی سکتے ہیں، اس بات کو پوری طرح سے نظرانداز بھی تو نہیں کیا جا سکتا چاچا۔''

اور اگر آ گئے تو......؟

''تب سمجھیے — انیل نے پوری گمبھیرتا سے کہا۔تب آپ ہی نہیں ہم بھی سر کھچت نہیں یعنی سچ بولنے والے اور تب وشواس رکھیے دیش ٹوٹ جائے گا۔''

انیل پھر سے سیاستدان کی طرح تقریر پر اتر آیا تھا۔

برکت حسین نے جھٹ بات بدل دی۔

''نریندر کہاں ہے؟''

نریندر— انیل نے منہ بنایا۔آج کل بھاجپا اور آر ایس ایس والوں کی خوب میٹنگیں چل رہی ہیں۔اور آپ تو جانتے ہیں کہ نریندر پرانا بھاجپائی ہے۔

برکت حسین نے دعا دی...... بیٹا بھاجپائی ہو یا کانگریسی۔دونوں میری آنکھوں کے سامنے پلے ہو...... گودی میں کھیلے ہو...... میں تو یہی دعا دیتا ہوں کہ بھائیوں میں میل محبت بنی رہے۔سب سے بڑی چیز یہی ہے۔

اندر سے کھکھارنے کی آواز آئی تھی۔

انیل بولا......لگتا ہے پتا جی آ رہے ہیں۔اچھا چاچا جی...... میں چلا۔

بالمکند شرما جوش نے برکت حسین کو دیکھا— میاں، آج شطرنج اکیلے ہی کھیل رہا تھا۔تم آ گئے تو...... چلو ایک بازی ہو جائے اور ہاں...... کچھ تازہ تازہ اشعار ہوئے ہیں۔وہ بھی سن لینا۔'

چلیے۔جب اشعار ہو ہی گئے ہیں تو آپ کہاں بخشنے والے ہیں۔

(۲)

مالو صبح سے کھانس رہی تھی۔

بالمکند پچھلے دنوں کا زخم بھلانے کے لیے پھر سے شاعری کی دنیا میں واپس آ چکے تھے...... کمرہ تھا اور ان کا ٹہلنا...... ٹہلتے ٹہلتے...... ریک سے، اردو کتابوں کے درمیان سے کوئی کتاب اٹھا لیتے۔الٹتے پلٹتے۔پھر شاعری کی دنیا میں کھو جاتے......

اماں قافیہ تنگ ہے...... بات نہیں بن رہی ہے......

ٹہلتے ٹہلتے......وہ ٹھہرے...... مالو کھانس رہی ہے۔پریشان ہو گئے بالمکند — غیر ذمہ دار لڑکے۔بچی کھانس رہی ہے یہ نہیں کہ ڈاکٹر کے یہاں لے جائیں۔

نریندر— انہوں نے پکارا—

دو ایک پکار کے بعد بہو کی آواز سنائی پڑی۔

کیا ہے باؤ جی۔

''یہ مالوکھانس کیوں رہی ہے؟''

''ہلکا ہلکا بخار ہے بابو جی۔''

''بخار ہے؟'' وہ ٹھہر گئے۔ڈاکٹر کو دکھایا۔؟

''نہیں۔''

کیوں۔؟

اومانے سر جھکا لیا۔وہ کام سے چلے گئے۔

''گھر میں اور کوئی نہیں ہے۔''

''میں ہوں نا؟''

اومانے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا۔اوہ— بالمکند نے سمجھا۔انیل ہوگا۔ بہو بولنے سے کترا رہی ہوگی— انہوں نے انیل کو پکار لگائی۔انیل آ گیا تو وہ شکایت کے لہجے میں بولی۔

''گھر میں ہوتو گھر کا کچھ خیال بھی تو رہنا چاہئے۔''

''ہوا کیا ہے؟''

مالو بیمار ہے۔ڈاکٹر کے یہاں لے جانے والا کوئی نہیں۔

انیل کے ماتھے پر شکن پڑ گئی— نریندر اپنی ذمہ داری سمجھتا ہی نہیں۔

''چلو۔نریندر نہیں ہے تو کیا ہوا۔تم تو ہو۔''

بالمکند کہتے کہتے ٹھہر گئے۔انہوں نے دیکھا،انیل کے چہرے پر شکن پڑ گئی ہے، تجربوں کے حوادث سے گزرتے ہوئے سرد اور گرم موسموں کا اندازہ تو ہو ہی گیا تھا،انہیں...... کہ اب وہ پرانا زمانہ نہیں رہا۔تعظیم وتکریم کی روایت بھائیوں کے درمیان سے بھی اٹھتی جارہی ہے۔

انیل کچھ سوچتا رہا۔پھر بولا۔

''پتا جی۔مجھے پریس کا کام ہے۔''

ڈاکٹر جسوال پڑوس میں ہی تو رہتے ہیں بیٹا۔

''اب میں کیسے کہوں۔مجھے کام ہے۔''

انیل ٹھہرا نہیں فوراً چلا گیا۔

وہ چھن سے رہ گئے۔بھائیوں کے درمیان خلش اس حد تک بڑھ چکی ہوگی۔انہیں پتہ نہ تھا— وہ چھوٹی سی بچی۔مالو......اس کا قصور کیا ہے۔

مشاعرے کے لیے غزل پوری نہیں ہوئی۔مگر مشاعرے میں تو جانا ہے۔پچھلے دنوں ہوئے دنگوں اور فرقہ واریت کے خلاف یہ مشاعرہ ہے......ایسے مشاعروں میں تو جانا چاہئے نا،اپنا آپ نکال کر ہلکا کرنا چاہئے نا...... بیٹھے ہوئے لوگ......شعروشاعری کی ادبی فضا اور غزل کا حسن— ذرا دیر کو جی بھی بہل جاتا ہے اور بالمکند شرما جوش کو روحانی تسکین بھی مل جاتی ہے۔

مالو......رے مالو......

آواز لگاتے ہوئے نیچے تک آئے......لیکن ددو کہنے والی سریلی آواز چپ ہی رہی۔

بستر پر مالو پڑی بخار سے تپ رہی تھی......انہوں نے پیشانی چھوا اور لگا ہاتھ جیسے گرم گرم توے پر پڑ گیا ہو۔

''ارے اسے تو سخت بخار ہے۔ بہو......''

ہارلکس کا گلاس لے کر اوما کمرے میں آ گئی......اس کے چہرے پر غصہ تھا۔ وہ شکایت کے لہجے میں بولی۔

''میں پہلے ہی آپ کو منع کرنے والی تھی بابوجی۔ زبان خالی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہماری بچی مرے چاہے جیے۔ کسی کو کیا فرق پڑتا ہے۔''

''بہو!''

اوما جیسے بہاؤ میں بہہ گئی تھی...... بہت ضبط کیا ہے بابوجی......چھوٹے چھوٹے کام سے لے کر پورے گھر کی صفائی تک۔ جیسے ایک نوکرانی میں ہی رہ گئی تھی۔ دوسرے کسی کو خیال بھی نہیں......ارے آدمی ایک گھر میں رہتا ہے تو اس کے سکھ دکھ کے بارے میں تو پوچھتا ہے نا، یہاں تو یہ بھی نہیں...... یہ بھائی ہیں ان کے...... ہمارے یہاں تو ایسا نہیں ہوتا۔

اوما کو موقع ملا تھا—

بالمکند نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔''بہو دھیرے بول۔ اس طرح کی باتوں سے کیا فائدہ۔ لاؤ میں لے جاتا ہوں۔''

''نہیں میں لے جاتی ہوں۔''

اوما ہارلکس پلاتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی...... یہاں سب کو میری بات زہر لگتی ہے میری بچی مر رہی ہے۔ لوگوں سے یہ بھی نہیں ہوتا کہ اس کی خیریت ہی آ کر پوچھ لیں۔'

بالمکند شرما جوش بے دلی سے اپنے کمرے میں لوٹ آئے۔ مالو کی بیماری بہو کا غصہ، اور آپس میں بڑھتے ہوئے فاصلے اب شعر وشاعری کچھ بھی بھلی نہیں لگ رہی تھی......ایک بار پھر وہ پچھلے دنوں کے ماحول میں پہنچ گئے تھے اور دماغ میں صرف توپیں گرج رہی تھیں اور چیخیں سنائی دے رہی تھیں—

(۳)

انیل کا آفسیٹ پریس کا بزنس تھا— پریس کے سلسلے میں کام لانے کے لیے وہ زیادہ تر سرکاری اور پارٹی دفتروں کے چکر کاٹا رہتا تھا...... پارٹی آفسوں سے ہی اسے اتنا کام مل جاتا کہ اس کے لیے جلد انجام دینا آسان نہ ہوتا۔ کلینڈر، اشتہاروں سے لے کر بینر پتریکائیں اور چھوٹے موٹے بروشیئر تک......ایسے ہی کام کے سلسلے میں کانگریس پارٹی سے اس کا جو ناطہ جڑا وہ فیشن سے لے کر اس کی ذاتی دلچسپی کا بھی ایک حصہ بنتا گیا۔ پارٹی دفتروں میں اس کے تجربے بڑے انوکھے ہوتے۔ جیسے کانگریس سیوادل میں اس نے ایک آدمی کو پچھلے برس چپراسی کے طور پر چائے پلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے خود اس کے ہاتھوں سے چائے پی تھی۔ اور اس بار اسے شاندار جیپسی سے آتے دیکھا تو وہ چونک پڑا۔ یار یہ پارٹی آفس ہوتی ہے یا حیرت کرنے کی جگہ......اس آدمی کا نام جاوید تھا اور پچھلے کئی برس سے وہ اپنے علاقے کے ادھیکچھ پد کو پراپت کرنے کی لڑائی لڑ رہا تھا۔ سو ایک موقع مل گیا......اور چائے پلاتے پلاتے جاوید جیپسی میں بیٹھنے کے لائق ہو گیا—

انیل کو رشک آتا تھا۔ ایک موقع ملے تو آدمی کہاں سے کہاں اٹھ آتا ہے۔ اور ایک اس کا بزنس ہے۔ بے غیرتوں کی طرح ٹراتے رہو۔ بھاگتے دوڑتے رہو۔ یہاں تو پیسہ بھی ہے نام بھی ہے— اتفاق سے سیوادل کی معرفت ایسے لوگوں سے واسطہ پڑ گیا تھا، جن کے اثر ورسوخ بھی زیادہ تھے۔ پچھلے لوک سبھا چناؤ کے وقت سیوادل کے کئی لوگوں نے پارٹی دفتروں میں اپنا اپنا بایوڈاٹا بھجوایا تھا۔ یونہی مذاق مذاق میں اس سے بھی کہا گیا۔''بھائی سارے لوگ بھر رہے ہیں۔ تم بھی اپنا بایوڈاٹا دے دو۔''

''لیکن میں کیا دوں گا۔ میں تو پارٹی کے لیے کچھ کیا ہی نہیں ہے۔''

رامیشورنیکھر اجی مسکرائے تھے —''انیل شرما جی۔ ارے کرتا کون ہے۔لکھ لیجئے اتنے پرشکچھن شور میں بھاگ لیا۔سیوادل ریلی میں رہے۔اپنے یہاں کیمپ لگایا باقی تفصیل ہم سویم بتا دیں گے......ارے سب چلتا ہے۔آپ ایک بایوڈاٹا دے ہی دیجئے۔''

''سب فالس چلتا ہے تو پھر دے ہی دوں گا۔''

انیل نے ایک بایوڈاٹا بھی جمع کر دیا۔پسند کی کانسٹی ٹیونسی میں اپنے شہر کا نام بھر دیا لیکن بایوڈاٹا جمع کرنے سے بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ لیکن اس سے ایک بات ہوئی نیتا گیری کی بھوک بڑھ گئی— جیسے اب وہ جاننے کو بے چین رہتا تھا کہ کہاں کیا ہو رہا ہے......کب ہو رہا ہے اسے کیا کرے، ہولی دیوالی میں بڑے بڑے افسروں تک مٹھائی لے جانے سے کر سبھاؤں کے نام پر پیسے تک خرچ کرنے سے وہ چوکتا نہیں تھا۔اب تو پاس پڑوس کے لوگ اس کے پاس کام بھی لے کر آنے لگے تھے۔یہ کرا دیجئے۔آپ کی پہنچ منسٹروں تک ہے۔آپ سے ہو جائے گا۔آپ جو پیسہ کہیں ہم آپ کے ہاتھ پر رکھ دیں مگر کام ہو جانا چاہئے۔

لیکن برا ہو نریندر کا۔گھر میں ہی اس کا پرتیدوندی (مخالف) موجود تھا نریندر کو انیل کے ملنے والے کانگریسی پسند نہیں تھے تو انیل کو ہندو دھرم کا بھونڈا پردرشن کرنے والے بھاجپائی......جیسے وہ نیل کنٹھ کا بچہ جو بے شرم ہو کر جوڑ تا تھا۔

انیل بھیا۔جے شری رام۔

ایک بار اس نے ٹوکا بھی تھا۔''ارے نیل کنٹھ ہم کو کا کہتے ہو جے شری رام۔رام جی تو بس تمہارے ہیں اب۔''

نیل کنٹھ نے ٹھہاکا لگایا— ''ایسا کیا ہوا بھیا— رام جی تو سب کے ہیں— سارے جگ کے رام۔''

''سارے جگ کے پہلے تھے۔اب تو تمہارے ہیں......تمہاری پارٹی کے۔''

''پارٹی وارٹی کی بات یہاں چھوڑیئے بھیا۔آپ ہیں تو ہمارے بڑے بھائی سمان۔دیکھیے گا ایک دن آپ بھی ہماری اور لوٹ آیئے گا۔''

انیل کھیج سے بھر گیا۔اس کا گھر نہیں ہوتا تو وہ بھی دس گالیوں سے دعوت کرتا نیل کنٹھ کی لیکن ایک تو اس کا گھر، اس کے چھوٹے بھائی کا دوست۔اور بچپن سے سنتا آیا تھا۔گھر آئے مہمان کی بے عزتی نہیں کرنا چاہئے۔سوچپ رہنے میں ہی اس نے بھلائی سمجھی۔

نیل کنٹھ من ہی من مسکراتے ہوئے اندر نریندر سے ملنے چلا گیا۔

●●

انیل سے بھی آئے دن پارٹی اختلاف کو لے کر اس کی بحث ہوتی رہتی۔کہنا چاہئے معاملہ دل کی سطح پر کچھ اتنا بڑھا تھا کہ اب ملنے ملانے میں بھائیوں جیسی بات رہی نہیں تھی۔اس بات کو نریندر بھی جان رہا تھا اور انیل بھی محسوس کر رہا تھا۔

خیالات کی سطح پر اس فرق نے دونوں بھائیوں کے بیچ رنجش پیدا کر دی تھی— کہاسنی کا تو ماحول پہلے سے ہی بن گیا تھا لیکن دھیرے دھیرے ان کے آپسی تناؤ سے بھی جو فضا بن رہی تھی، اس نے گھر کا سکون چھین لیا تھا۔

انیل گھر آیا تو تلسی پہلے سے ہی اپھنائی بیٹھی تھی۔پتی کی چھتر چھایا ملتے ہی اس نے رونا دھونا شروع کر دیا۔

''ارے ہوا کیا؟''

''اب ہونے کو رہ کیا گیا ہے اس گھر میں۔''

انیل کا ماتھا ٹھنکا۔صاف صاف کیوں نہیں بتائی۔

لو یہ صاف صاف پوچھتے ہیں...... تلسی زور زور سے رونے لگی تھی......جیسے جانتے ہی نہیں۔سارا دن اکیلا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور گالیاں کھانے کے لیے ہمیں چھوڑ جاتے ہیں۔

''کسی نے کچھ کہا کیا؟''

اب اس کے علاوہ اور ہے کیا اس گھر میں— مالو کو آپ لے نہیں گئے— اور اومانے جو کھری کھوٹی باؤ جی کے رہتے ہمیں سنائی

ہے......ارے میں کہتی ہوں......آپ کی کوئی حیثیت ہے بھی اس گھر میں کہ نہیں۔ کتنی بار کہا، اس گھر سے جھنجھٹ ہٹا لیجئے—یا تو اپنا چوکا چکی الگ کرا لیجئے یا پھر کہیں اور مکان لے لیجئے۔

انیل بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

تلسی اب بھی روئے جا رہی تھی۔

انیل نے ٹھہر کر کہا، تم سچ کہتی ہو...... پانی سر سے اونچا ہونے لگا ہے۔ باؤ جی کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ باؤ جی نے ہمیں اپنا ہی کب سمجھا۔ بس ماں تک۔ ماں تھی تو اس گھر کا واتا ورن ہی دوسرا تھا...... ماں کے بعد تو ہم ایکدم اناتھ ہو گئے۔ یوں بھی بابو جی نے...... سچ کہوں تو کبھی بیٹے جیسا ہمیں نہیں سمجھا۔ ہاں بس دکھ تکلیف میں خیر خبر پوچھ لی۔''

''خیر خبر بھی نریندر اور گھر والی کی ہی پوچھتے ہیں ہماری کہاں۔ ہم مریں یا جئیں۔''

''لیکن یہ تو باؤ جی کی شروع سے عادت ہے—'' اماں کہتی تھیں، باؤ جی ہمیں اپنے انداز سے تعلیم دلوانا چاہتے تھے۔ اماں اور اماں کے ماتا پتا کو یہ پسند نہیں تھا۔ باؤ جی چاہتے تھے کہ ہم اردو پڑھیں ہمارے لیے ملا مولوی رکھے جائیں جب کہ اماں اور اماں کے ماں باپ سمجھ چکے تھے کہ وقت بدل چکا ہے لیکن بابو جی نہیں سمجھے۔ مسلم نوابوں اور گھرانوں کی جو چاٹ انہیں کل لگی تھی۔ وہ آج بھی لگی ہوئی ہے اس لیے باؤ جی کو ہم دوش نہیں دیتے۔ باؤ جی بھی ہم سے کٹے کٹے رہتے ہیں۔

''لیکن یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ او ما بولے جا رہی تھی باؤ جی کو بڑی بہو کا تو کچھ لحاظ ہونا چاہئے تھا—

●●

انیل نے آتے ہی صبح کے یہ جو کارنامے سنے تو دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ آئے دن ایسی باتوں نے جینا حرام کر کے رکھ دیا تھا۔ آنکھوں کے آگے اماں اترتی تھیں......اماں جو کہا کرتی تھیں......ارے نادانو......تم کچھ بن گئے تو یہ سب میرے کارن ہے۔ بھگوان کا نام لو جو میری جیسی ماں نصیب ہوئی ورنہ تم لوگوں کے باؤ جی کم ضدی نہیں تھے۔ ارے میں تھی جو اپنی ہٹ پر قائم رہی۔ ورنہ تمہارے سروں پر ٹوپیاں چڑھی ہوتیں۔

باؤ جی ایسے کیوں ہیں؟ اسے تو اب دور دور تک کوئی بھی ایسا نظر نہیں آ رہا تھا۔ آزادی کو تو برسوں گزر گئے۔ اب دور دور تک دیکھیے تو باؤ جی جیسے لوگ نہیں ملیں گے......ارے تین چار سال بہت ہوتے ہیں پریورتن کے — کتنا بڑا پریورتن آ گیا— سب کچھ بدل گیا۔ بابو جی کے سنسکاروں میں نہیں آیا— یاد آیا ایک بار اسی سنسکار کی بات پر باؤ جی بگڑے تھے۔ تم لوگ سمجھتے ہو کہ بس سارا دن پوجا پر بیٹھا رہوں تبھی سنسکار رہے۔ ارے صبح اٹھتا ہوں نہا دھو کر رام نام جپتا ہوں۔ پوجا کر لیتا ہوں یہ سنسکار رہے۔ پھر اس کے بعد میری دنیا ہے...... اور اپنی دنیا اپنی طرح سے جیتا ہوں میں......اور جان لو......اپنی دنیا اپنی طرح سے جینا کسی دھرم میں گناہ نہیں ہے۔

جب کالج میں تھے تو دوست یار حیرت کرتے تھے تمہارے باؤ جی اردو پڑھتے ہیں شاعر ہیں، اچھا لکھ بھی لیتے ہیں...... سچ تو یہی تھا کہ اس وقت تک اردو پڑھنے اور لکھنے کے دستور سے باہر نکل آیا تھا زمانہ — غیر مسلموں کا اردو پڑھنا اب حیرت کی بات تھی۔ حیرت کی بات اس لیے کہ گنے چنے پرانے زمانے کے کچھ لوگ ہی رہ گئے تھے۔ انیل اور نریندر کو تو اردو کے لکھے کیڑے مکوڑوں سے زیادہ نظر نہیں آتے تھے— مگر باؤ جی کی دنیا یہی تھی......یہی مختصر سا جہاں انہوں نے آباد کر رکھا تھا— اور شاید اسی غم میں پگھلتے رہے تھے کہ ان کے بچوں نے اس کے طور طریقے رہن سہن نہیں سیکھے۔ اب یہ سب ان کے بعد ختم ہو جائے گا۔

●●

شام میں نریندر آیا تو نریندر کٹا کٹا سا تھا۔ ایک بار باتھ روم جاتے ہوئے دونوں کی ٹکر بھی ہوئی۔ نریندر کی آنکھوں میں تیکھا پن تھا۔ جیسے انیل سے چڑھا ہوا ہو— انیل بھی چپ رہا— دونوں بہوئیں اپنے اپنے کمرے میں بند تھیں۔

شام کو بالمکند کو چائے کی طلب ہوئی...... بہو...... بہو کہتے ہوئے نیچے آئے۔ ہوا میں الفاظ اچھالے......

''ارے کوئی اس بھوکے پیاسے کو چائے پلا سکتا ہے۔ایک کپ چائے کا سوال ہے۔''

آئے تھے اچھے موڈ میں۔شکل سے بنایا تھا اچھا موڈ۔سوچا تھا صبح کا زہر کافور ہو گیا ہوگا۔لیکن نیچے اترنے پر آواز لگاتے ہی جو پہلی چوٹ ان پر ہوئی تھی۔وہ تھی— بڑی بہو نے زور سے دروازہ بند کیا تھا۔جھٹ سے اس زور سے بند کرنے کا مطلب تو وہ اچھی طرح سمجھتے تھے...... بہو ناراض ہے۔مگر اس میں انکا کیا قصور......اچھے موڈ کا فوراً ہی ستیاناس ہو گیا تھا— تبھی ساڑی کا پلو برابر کرتی بغل والے کمرے سے اوما نکلی۔

''باؤجی چائے چاہیئے۔''

''ہاں۔مالو کیسی ہے۔''

''اندر آیئے نا۔اب اچھی ہے......ددو......ددو پوچھ رہی تھی۔''

''ٹھیک ہے بہو۔جب تک مالو سے بات کرتا ہوں......تم چائے بناؤ—''

وہ کمرے میں آئے...... مالو اب چہرے سے صحت مند لگ رہی تھی......ددو کو دیکھ کر مالو نے تالی بجائی......

''آ گئے ددو......واہ......واہ......آ گئے ددو۔''

''ہاں آ گیا۔لیکن مٹھائی نہیں لایا۔''

''کیوں؟''

''پہلے طبیعت خراب کر لیتی ہے......ددو کو چائے کے لیے نہیں پوچھتی ہو......اور......چائے تو ممی بنانے گئی ہیں۔''

''ہاں—''

''اچھا ایک بات پوچھوں ددو۔''

بخار کے بعد صحت مند کے آثار نے مالو کو کھلا دیا تھا—

''یہ دنگے کیوں ہوتے ہیں ددو......دنگوں میں لوگ ایک دوسرے کو جان سے مار دیتے ہیں۔مندر توڑ دیتے ہیں۔''

''چپ''

''کوئی مندر توڑے گا تو میں ایک جھاپڑ لگاؤں گی۔''

''چپ''

''اچھا یہ مسلمان لوگ مندر توڑتے ہیں نا۔''

''چپ......وہ زور سے ڈکرے، یہ کون سکھاتا ہے الٹی سیدھی تجھے۔''

''پاپا کے دوست آتے ہیں نا۔میں سب سنتی ہوں۔''

وہ سنجیدہ ہو گئے...... یہ چھپ چھپ کر بڑوں کی باتیں سننا اچھی بات نہیں ہے بیٹا۔مندر مسجد کوئی نہیں توڑتا—وہ پیار سے بولے۔اور ایک بات اور سن لو بیٹا— تم بڑی ہو؟''

''ہاں۔''

''تم اور بڑی ہوگی؟''

''ہاں''

''اور ایک دن کالج میں پڑھوگی۔''

''پڑھوں گی؟''

''پھر پاپا جتنی ہو جاؤ گی؟''

''ہاں۔''

تو ایک بات غور سے سن لو بیٹی۔ ابھی جو کچھ سن رہی ہو، وہ کوئی بات سچ نہیں ہے کسی بات پر وشواس مت کرنا۔ اس سے تمہاری پڑھائی پر اثر پڑے گا۔ تمہارے کل پر آنے والے کل پر۔ کل تمہارے پاس ان باتوں پر سوچنے، وچارنے کے لیے کافی وقت ہوگا۔ بس کل غور کرنا ان پر۔ اور ان پر غور کرنے کے لیے کسی دوسرے کا سہارا مت لینا۔ اپنے صحیح دماغ کا فیصلہ ہی سننا ہے ایسی کوئی بھی بات کی، تو پھر میں ناراض ہو جاؤں گا میں کچھ نہیں بولوں گا۔

''اچھا ددو۔''

مالو خوش ہوگئی۔

اوما چائے لے کر آ گئی۔ وہ چائے پینے لگے۔ مگر ذہن میں ابھی بھی خلفشار مچا تھا — یہ نریندر گھر میں پارٹی کا کاریالیہ کیوں بنا رہا ہے۔ گھر میں ایسی باتیں کیوں کرتا ہے؟ نریندر آیا تو وہ پوچھیں گے...... آخر پوچھنے کا یہ حق بھی تو انہیں نریندر ہی نے دیا ہے...... انہیں جیسے کچھ یاد آ گیا......'

●●

اس دن رات کے گیارہ بج گئے تھے...... وہ کسی مشاعرے سے لوٹے تھے کہ دروازہ پر نریندر کو دیکھ کر تھم سے گئے —

نریندر نے دیکھتے ہی پوچھا ''پتا جی مشاعرے سے آ رہے ہیں کیا؟''

وہ جیسے ایک دم سے بدمزگی کے شکار ہو گئے —

''ہاں۔ کیوں؟''

''کیا ملتا ہے وہاں...... آپ ہمارے ساتھ تو بیٹھتے نہیں کبھی......'' نریندر کی آواز ٹوٹ رہی تھی......

اچانک جانے کیا ہوا، وہ بھپر گئے —

''نریندر۔ یہ گھر کس کا ہے؟''

''آپ کا''

''یہ چھت......؟''

''آپ کی ہے۔ نریندر گڑ گڑا کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''تم کون ہو۔؟''

''آپ کے لڑکے۔''

''تمہیں اتنا بولنے کا ادھیکار کس نے دیا۔''

وہ غصے میں تھر تھر کانپ رہے تھے۔ بہت کچھ تم بھی دیکھ رہے ہو...... بہت کچھ ہم بھی دیکھ رہے ہیں۔ جو نہیں سمجھ سکو تو پھر آئندہ مت بولنا۔ تم یہاں، اس گھر میں، دھرم کے نام پر جن بے بڑھے لکھے راجنیتک بھرشٹ لوگوں کو لے کر آتے ہو، میں نے کبھی اعتراض کیا کہ اس گھر کی ہوا سدا سے شدھ رہی ہے......''

وہ اپنی آواز پر کنٹرول بھول گئے......'' اسے اپوتر مت کرو...... اسے اشدھ مت کرو۔ میں نے کبھی کہا تم بھی مت کہنا۔ آئندہ خیال رہے......''

ان پر جیسے دورہ پڑا تھا۔ وہ غصے میں تھر تھر کانپ رہے تھے۔ نریندر، اوما، تلسی، انیل سب حیرت سے انہیں گھور رہے تھے۔

دوسرے دن صبح کے ناشتے پر نریندر نے کہا۔

’’آپ ناحق ناراض ہوگئے پتا جی ......میرا مطلب وہ نہیں تھا......‘‘

نریندر مسکرا رہا تھا۔’’مالو تو ڈر گئی تھی۔ لیجئے نا پتا جی ...... یہ لیجئے— نریندر سبزی کی پلیٹ ان کی طرف بڑھاتا ہوا کہہ رہا تھا— اپنے دھرم کو ماننا گناہ ہے کیا......دھرم کا پرچار گناہ ہے کیا۔ یہی تو کرتے ہیں ہم ...... پہلے مغل پھر انگریز۔ اپنا گھر، اپنا کبھی نہیں لگا۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ ہم بھی داس ہیں۔ اور دوسرے دھرم والے بھارت کو اپنے پرچار اور پرسار کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اور اگر یہی کام ہم کرتے ہیں تو ہم دوشی بن جاتے ہیں۔ ہم پر ہی آروپ اور لانچھن آتے ہیں۔ ہمیں ہی بدنام کیا جاتا ہے۔ آپ بھی ہمیں غلط سمجھتے ہیں کھائیے نا۔ لیجئے نا......‘‘

اتنا کہہ کر اس کی ہمت بندھی تھی— آپ کو تو ہمارا ساتھ دینا چاہئے— ہماری پارٹی کے لوگ کہتے ہیں کہ نریندر تم تو اپنے گھر میں ہی ٹوٹے ہوئے ہو۔ سچ پتا جی، اس پر شرم لگتی ہے۔ انیل بھیا ایک ایسی پارٹی کے لیے ہمارے وِرودھ ہیں جو سوارتھی (خود غرض) ہے اور پورے دیش میں ہونے والے دنگوں میں جس کی پرمکھ بھومیکا رہی ہے۔ ہماری پارٹی کو تو ناحق بدنام کیا جاتا ہے......آپ دیکھ رہے ہیں اکھنڈ دیش جاگ رہا ہے۔ اکھنڈ بھارت ورش......

’’اکھنڈ بھارت ورش......‘‘

بالمکند شرما جوش جیسے یکا یک کسی ڈراؤنے خواب سے جاگ جاتے ہیں۔ اکھنڈ بھارت لیکن اکھنڈ بھارت کہاں ہے......وہ تو کھنڈ بھارت کو دیکھ رہے ہیں......زہریلا ریلا بہہ رہا ہے......چاروں طرف سے زہریلے سانپ اپنے اپنے بلوں سے نکل کر اسے گھیر کر کھڑے ہوگئے ہیں......

یہ بچے کیا سمجھتے ہیں اپنے آپ کو...... ہر برے کام اور برائی کو کیسے کیسے ناموں سے تسلی اور پنیہ قرار دیتے ہیں— پھر اسی دلیل کے ذریعہ اپنا ہی گھر توڑنے میں لگ جاتے ہیں......

لیکن یہ بچے ان کے بچے کہاں ہیں...... یہ تو بھاجپائی ہیں...... یا کانگریسی...... یہ ان کے بچے کہاں ہیں......

پھر وہی کمرہ ہے......ان کا اپنا کمرہ......ان کی تنہائی کا رفیق، مونس و غمخوار...... یہ ان کا کمرہ ہے...... جہاں وہ اپنی تنہائیاں پیوست کرتے ہیں، اپنا اتیت یاد کرتے ہیں اور سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

(۴)

نلکانی کہتا ہے ایک فساد چاہئے۔ اس شہر کو پھر ایک فساد چاہئے۔ ایک ماہ گزر گیا۔ لوگ اپنی دنیاؤں میں واپس آنے لگے ہیں— ریہرسل چلتی رہے تو ہم لوگوں کے دلوں میں بنے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر نریندر روہسکی کا ایک چھوٹا سا پیگ تیار کرتے ہیں۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ ہے۔ یہ چوتھا پیگ ہے ان پر ہلکا ہلکا خمار چھانے لگا ہے۔

’’گھبراؤ مت نلکانی۔ اگلے الیکشن میں مجھے ٹکٹ ملنے ہی والا ہے۔ پھر اس شہر کی تقدیر بدل دوں گا۔‘‘

سدھیند ورائے مسکراتے ہیں۔’’ڈاکٹر نویندو۔ آپ پر نشہ چھانے لگا ہے۔‘‘

یہ نشہ نہیں ہے سدھیند ورائے۔ یہ جیت کا نشہ ہے۔ ایک بار پارٹی کو ستہ میں آجانے دو—‘‘

نلکانی پھر کہتا ہے۔ دلوں میں زہر بھرنے کے لیے ایک فساد ضروری ہے۔ ہمیں یہاں بھاجپا کا ووٹ بنک تیار کرنے کا حکم ہوا ہے اور محض ایک پھلجڑی چھوٹ کر رہ گئی۔

نیل کنٹھ مسکراتا ہوا کمرہ میں داخل ہوا— سب کو جے شری رام کرتا ہوا وہ کرسی پر دھنس جاتا ہے۔

''کیا خبر ہے؟'' نلکانی بیڑی سلگاتے ہیں۔

''خبر اچھی نہیں ہے نلکانی جی...... ہم تو جہاں بھی گئے ہیں، لوگ باگ ہماری پارٹی کو برا بھلا کہہ رہے ہیں۔''

سدھیند ورائے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔'ان کا دھیان بدلنے کی ضرورت ہے۔اور اس کے لیے......'

اوپر سے آئے نردیش (حکم) پر وہ دھیمے دھیمے آپس میں باتیں کرتے رہے...... باتوں کا مدعا یہ بھی تھا کہ پارٹی اگلے چناؤ کے لیے پس وپیش میں ہے کہ وہ رام جی کو مدعا بنائے یا نئے طرح کے بجٹ کو ــــ ورلڈ بینک کے پاس گروی پڑے بھارت کے ارتھ تنتر کا مدعا رکھے یا اسے برا بھلا کہنے والوں کا منہ بند کئے جانے کے بارے میں غور وخوض ہو ــــ یہ بھی تھا کہ کمیونزم پردیش کی تمام پارٹیوں کو ڈبیٹ کی صلاح دی جائے ــــ اور اس سے ان لوگوں کی ان پارٹیوں کی قلعی کھولی جائے جو بی جے پی کو کمیونل کہتے ہیں۔

''تحسین کہاں ہے؟''

نلکانی کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔''اب طبیعت تو ٹھیک ہے۔؟''

''ہاں۔''

''اب پہلے جیسا کھویا کھویا تو نہیں رہتا؟''

''نہیں۔ہم نے اپنی گتی ودھیوں کی جانکاری دے دی ہے۔اور آرمبھ میں سویم کو سیٹ کرنے میں سمے تو لگے گا ہی کیوں کہ بیسکلی وہ مسلمان ہے۔اور اوپر سے ہماری پارٹی مسلم ورودھی تو نظر آتی ہی ہے ــــ''

وہ دھیرے دھیرے آپس میں کچھ باتیں کرتے رہے۔

نیل کنٹھ کچھ گھبرایا سا نظر آ رہا تھا۔

●●

منا گھر میں داخل ہوا تو کچھ گھبرایا سا تھا۔ہاتھ میں کپڑوں کا ایک تھیلہ تھا، جس میں کچھ پمفلٹ، اشتہارات اور چھوٹی چھوٹی اسٹیکرس تھیں، ظاہر ہے جس پر بھڑکاؤ باتیں لکھی تھیں۔جیسے مندر ہے اور وہیں بنے گا، جیسے اسٹیکرس گھر کے دروازوں کے باہر اور بس گاڑیوں میں چپکانے کے لیے تھے ــــ ان میں کچھ اسٹیکرس مسلم ورودھی بھی تھے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی پہلی ٹکر ابا سے لگی۔

برکت حسین اسے دیکھتے ہی ٹھٹھک گئے۔

رات کے ساڑے دس بج گئے تھے۔گو شہر کی فضا ٹھیک تھی۔دنگوں کی خوفناک ریہرسل کے بعد فضا میں دہشت کے جراثیم تو موجود تھے ہی۔کھیم پور میں ابھی بھی دہشت برقرار تھی۔یہیں ایک ہندو جھونڑے کی ہتیا ہوئی تھی۔اور اس کے بعد سے لے کر اب تک فضا میں تناؤ برقرار تھا...... یہاں مسلمان گھبرائے زیادہ تھے۔ہندوؤں کے گھر کم تعداد میں تھے۔لیکن آکروش اور غصہ زیادہ تھا۔کھیم پور کو گھیرنے والے محلوں میں ہندو اور مسلم محلے برابر کے تھے۔اس لیے کھیم پور کے ہندوؤں کو خطرہ تو تھا لیکن یہ امید بھی تھی کہ کچھ ہوا تو پاس پڑوس کے محلے والے ہندو بھی میاں کو چھوڑ ینگے نہیں۔ماحول دھیرے دھیرے عام زندگی میں لوٹ رہا تھا، لیکن چہروں پر خوف کی دھول اور شک کی پرتیں موجود تھیں۔

سب سے عجیب حالت ان دنوں منا کی تھی۔کرفیو کی رات غائب ہونے کے بعد سے لے کر اب تک وہ جیسے کسی ڈراؤنے خواب کی بیچ پھنسا ہوا تھا ــــ اسے لگ رہا تھا...... آکٹو پس کے پنجے اسے گھیرتے جا رہے ہیں...... ایک دلدل ہے، اور اس دلدل میں وہ اتنا پھنس گیا ہے کہ...... باہر نہیں نکل سکتا...... لیکن یہ سب اچانک نہیں ہوا تھا ــــ یکا یک نہیں ہوا تھا۔یہ تو ملک کی بدلتی ہوئی صورت حال اور سیاست کے نئے ماپ ڈنڈ کی وہ اٹھا پٹک تھی جہاں وہ جینے کا راستہ بھول چکا تھا...... ایسا سوچتا تھا منا۔

ہوش سنبھالا تو چودھری برکت حسین کے خانوادے میں ــــ ہوش کے نوالے لیتے لیتے یہی تو جانا تھا...... کہ ایک لمبے عرصے تک

مسلمانوں نے یہاں حکومت کی تھی۔ بابر بھی ایک بادشاہ تھا۔ ہلاکو بھی۔ نادر شاہ بھی......اور رنگ زیب بھی— ہندوؤں سے جزیہ لیا جاتا تھا۔ اسلام کا بڑا نام تھا— جو گھر میں سنتا— ابا کے منہ سے یا اردو کتابوں میں......اسکول جا کر معلوم ہوتا کہ میاں منا، تم تو سب کچھ غلط جانتے ہو۔ تم جن کی بہادری کے قصے رٹتے رہے ہو، وہ لوگ بہادر نہیں تھے— نادر شاہ تمہارے ملک کے خزانے خالی کرنے آیا تھا۔ اورنگ زیب اور بابر نے مندر توڑے— گھر باہر، پر بھاشائیں، تعریف سب بدلتی رہیں۔

پڑھنے میں دل تو لگتا نہیں تھا۔ اول فول سوچنے میں ہی زیادہ وقت گزرتا رہا— ادھر بڑا ہوا اور ادھر یہ سوچ ذہن پر حاوی ہوگئی کہ پہلے مسلمانوں نے قہر برپا کیا اور اب یہ— کبھی جن سنگھ......کبھی آر ایس ایس کے نام پر مسلمانوں کا دامن زندگی تنگ کرتے رہیں گے— وہ ایسا ہو گیا کہ دھیرے دھیرے تنگ نظر ہوتا گیا— محرم کے اکھاڑے میں اسے چاروں طرف مسلمان چہرے......مسلمانوں کی بھیڑ نظر آتی تو وہ خوش ہو جاتا۔ ڈنڈا بھالا بھانجتے ہوئے مسلمانوں میں اسے سلام کے عروج کا خواب نظر آتا۔ مسلمان کی بدحالی، نوکری اور دیگر معاملوں میں تنگ نظری کے لیے وہ حکومت اور ہندوؤں کو قصوروار مانتا۔ جیسا کہ اس نے ایک بار ابا سے اپنی بے روزگاری کے دنوں میں کہا تھا۔

’پڑھ لکھ کر کروں گا بھی کیا۔ مجھے یہاں نوکری تھوڑے مل جائے گی۔‘

برکت حسین اس کا حیرت سے منہ دیکھ رہے تھے۔

●●

یہ ہندستان نہیں حیرت گاہ تھی۔ اس کے لیے قدم قدم پر حیرتیں— لوگوں کے چہروں پر حیرت اگتی تھی۔ ہر دن کے اخبار میں حیرت اگتی تھی۔ فساد نہیں ہوتا تھا، تب حیرت......ریل گاڑی ٹھیک وقت چلی، تب حیرت، کوئی کام اپنے صحیح طریقے سے ہو گیا، تب حیرت...... اور اسی حیرت گاہ میں سہا سہا منا چلا جا رہا تھا۔ اور وقت گھرنیوں پر ناچ رہا تھا۔

پہلے اس نے تقسیم وطن کے حالات سن رکھے تھے۔ کچھ کتابوں میں پڑھے۔ کچھ بزرگوں سے قصے سنے اور پھر ملک کے حاشیے پر یہ قصے وہ روز پڑھنے لگا......فساد......آگ زنی......چاروں طرف فساد......چاروں طرف مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے—

بجلی آفس میں کلرکی کرتے ہوئے کتنی ہی بار اس کے اندر کا مسلمان بھڑکا تھا یہ مسلمان دفتری ساتھیوں، کلیگ سے بات بے بات الجھا بھی— لڑا بھی— پھر دوستی یاری بھی ہوئی— ’میاں جی‘ کہہ کر چڑھایا بھی گیا۔ اسے برا بھی لگا۔ پھر دوستی کی رو میں بہہ گئے— چائے پی گئی۔ سگریٹ سلگائے گئے— اور مسئلہ اپنی جگہ بنا رہا—

منا محض ایک آدمی تھا— دائیں بائیں سے واقف نہیں تھا۔ جتنا ذہن سمجھاتا، اسی پر چلتا......اور اسی پر چلتے ہوئے اس نے فیصلہ لیا تھا کہ وہ بھاجپا سے جڑ جائے گا۔ جبکہ یہ جڑ جانے والی بات بھی اتفاق سے اس کے دل میں آئی تھی اور پھر اسی اتفاق کے راستے پر وہ چل نکلا—

چل نکلا—

دور تک اندھیرا تھا— اندھیرا—

منا کو لگتا تھا، اس کی آواز اس کا ساتھ چھوڑ گئی ہے......وہ محض ایک روبوٹ ہو گیا۔ مشینی آدمی......وہ کٹھ پتلی ہو گیا ہے......وہ کسی اور کے اشارے پر چل رہا ہے......اسے کوئی اور نچا رہا ہے......وہ پھنس گیا ہے......

●●

کمرے میں داخل ہوتے ہوتے وہ چونک گیا—

چودھری برکت حسین اسے گھور رہے تھے—

’’تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے منا۔ چہرہ اتنا سپید کیوں ہو رہا ہے......‘‘

منا کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ ہاتھ میں تھاما ہوا کپڑے کا تھیلا کانپ گیا۔ اسے لگا، ابا کی آنکھیں تھیلے میں گھسی جارہی ہیں...... کیا ہے...... نکال...... جادوگروں کی طرح ہوگئی ہیں۔ ابا کی آنکھیں۔ ابا آنکھیں بند کریں گے اور ...... سب کچھ دیکھ لیں گے...... مگر آنکھیں بند نہ کریں تب بھی...... کان تو سلامت ہے نا...... اور آواز تو باہر بھی گونجنے لگی ہے...... باہر بھی گونجنے لگی ہے۔

جیسے منا کا دوست شمی چونکا تھا——

''کیا سن رہا ہوں یار؟ سچ ہے؟''

''ہاں۔''

اس کے ہاں کہنے پر وہ کیسا کٹھور ہوگیا تھا——'پاگل ہوگیا ہے کیا—— دماغ چل گیا ہے——' شمی نے پوچھا——'اچھا بتا—— نماز پڑھنے جاتا ہے؟ کم ازکم جمعہ کی نماز—— روزہ رکھے گا اس برس—— تو اللہ رسول کیخلاف جارہا ہے منا—— تو گندے راستے پر چل پڑا ہے——

اخلاق احمد اس کے اسکول کا دوست تھا۔ وہ تو جیسے اسکو مارنے کے لیے دوڑا تھا——

''کافر ہوتا تو کوئی بات نہیں۔ لیکن اپنا بھائی—— اخلاق کی مسلمان ہوتی داڑھی ہلی۔ سرمہ لگی آنکھوں میں غصہ کا طوفان مچلا—— اب تو اسلام کے خلاف چلے گا کم بخت—— تو خود کے مسلمانوں کے خلاف بولے گا...... اسی لیے جوائن کیا ہے نا......'

ایک دن سلیمان رنگ ریز اسے کھوجتا ہوا اس کے آفس آیا تھا۔ وہ بل کھڑکی پر تھا۔ سلیمان اسی کے محلے کا تھا۔ ہم عمر۔ اس لیے بچپن سے ہی دوستی تھی۔ سلیمان نے اسے اشارہ سے ایسے بلایا جیسے—— اس کے ہاتھوں ہوئے اچانک قتل کے بارے میں دریافت کررہا ہو......''

''یار، میں نے سنا تو دوڑا دوڑا آرہا ہوں...... یہ میں کیا سن رہا ہوں...... تو——؟

بہت دیر کے بعد وہ دہاڑا۔ ''جینا مشکل کردیا ہے تم لوگوں نے۔ جب تب آکر مجھ سے ایسے سوال کرتے ہو جیسے میں نے کسی کی جان لے لی ہو۔ ہاں، میں نے بھاجپا جوائن کرلی ہے...... تم اسے قتل کردینے والی پارٹی سمجھتے ہو...... ڈرتے ہو...... جتنا ڈرتے ہو، اتنا ہی ڈرایا جاتا رہا ہے تمہیں—— میں پوچھتا ہوں کیوں ڈرتے ہو اتنا۔ مقابلہ کیوں نہیں کرتے——''

''مقابلہ——''

سلیمان اَن پڑھ تھا۔ مقابلہ کی بات بھلا اس کی سمجھ میں کیسے آتی۔

وہ دھیرے دھیرے نرم پڑا—— ''تم کیوں نہیں سوچتے کہ کل یہ پارٹی حکومت میں بھی آسکتی ہے۔ تم اس کی اس قدر مخالفت پر اترے رہے۔ پھر کیا ہوگا سلیمان میاں تم ان کے خلاف بولتے رہے، بولنا بند نہیں کیا تو کیا حکومت میں آنے کے بعد یہ تمہیں زندہ چھوڑیں گے۔ ارے یہ تمہیں ملک چھوڑنے کے لیے بے بس کردیں گے——' یہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر تم پر پابندی عاید کریں گے۔ اذان لاؤڈ سپیکر سے مت دو۔ اتنی بڑی تعداد میں مسجد مت جاؤ۔ نماز مت پڑھو۔ تم کیا سمجھتے ہو۔ عرب ممالک—— وہ اسلامی ممالک جن پر تم فخر کرتے ہو، تمہاری مدد کو آجائیں گے۔ انہوں نے ایران عراق کی مدد کی......؟ صومالیہ کی مدد کی——؟ تمہاری کیوں مدد کرنے آئیں گے یہ؟ تم، زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا، اپلاؤ گے، غلط حرکتیں کروگے یا زیادہ سے زیادہ آتنک وادی بنوگے—— مجھے لگتا ہے یہ لوگ یہی چاہتے ہیں۔ تم لوگ اپنے ہوش گنوادو، آتنک پر اتر آؤ تاکہ یہ تمہارا دمن کرسکیں۔ تم پاگل ہوجاؤ۔ تاکہ انہیں پاگل کتوں کو شوٹ کرنے کا اچھا سا بہانہ مل جائے——''

سلیمان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، کیا کہہ رہے ہو منا بھائی۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ لیکن جو آرہا ہے، اس سے لگتا ہے...... تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔''

●●

سلیمان چلا گیا...... لیکن منا اب تک خوف و ہراس کے پل پر سوار تھا۔ کیا محض اتنی سی وجہ سے——؟ اس نے یہ خطرہ مول لیا ہے۔ کہیں اس کا کوئی سوارتھ بھی ہے—— کوئی غرض—— یا سیاست میں کود پڑنے کی انجان للک—— خطرہ بہت زیادہ ہے اور مسلمان مخالفت کا راستہ

چھوڑتے نہیں ہیں تو......خطرہ سوچ اور تصور سے زیادہ ہے......اور یہ مخالفت مسلمانوں کو بہت مہنگی پڑ سکتی ہے......

●●

چودھری برکت حسین اسے گھور رہے ہیں۔

''گھڑی دیکھ رہے ہو......بہو کتنی پریشان ہو جاتی ہے۔تمہیں سویرے آنا چاہئے۔''

''اوہ—ہاں......''

منا جیسے کسی خوفناک حادثہ کا شکار ہوتے ہوتے بچا۔

''یہ تھیلے میں کیا ہے؟''

وہ چونک گیا......''نہیں......کچھ نہیں......کچھ نہیں ہے......''

''اچھا جاؤ۔کھانا کھالو—''

منا آگے بڑھ گیا۔برکت حسین اب بھی اسے تعجب سے گھور رہے تھے۔

''پاگل لڑکا!''

وہ دھیرے دھیرے بڑبڑائے—

الزیمرس

(۱)

نیچے سے آواز مستقل آ رہی ہے.....'پتا جی آجایئے.....کھانا کھا لیجئے......آجایئے.....' سچ تو یہ ہے کہ انہیں صاف صاف سب کچھ سنائی پڑ رہا ہے......مگر...... کسے پکارا جا رہا ہے.....کون پکار رہا ہے...... یہ......آنکھوں کے آگے پھیلتا اندھیرا......جھل مل کرتا سویرا......سب کچھ سرخی مائل دھواں دھواں سا......

''پتا جی......کیا کر رہے ہیں......آتے کیوں نہیں......؟''

یہ کون چلا رہا ہے......کیوں چلا رہا ہے۔ کس قدر بے سری آواز ہے......وہ سکڑ گئے ہیں۔ دماغ بھک سے اڑا جا رہا ہے......ایسے جیسے برین ہیمرج ہو گیا ہے......نام کیا ہے......ان کا......کون ہیں وہ......؟

''وہ اٹھنا چاہتے ہیں......مگر نہیں...... بیٹھے رہتے ہیں......اسی انداز میں......جیسے گھٹنوں سے بیٹھے ہیں...... یہ سب کیا ہے......''

جیسے سب کچھ بھول جانے کی حالت ہوتی ہے......وہ بھول چکے ہیں......

نیچے کھانا لگ چکا ہے۔ ڈائننگ ٹیبل پر اوما، نریندر اور مالو بیٹھ چکے ہیں۔

''پتا جی نہیں آئے۔''

اوما برا سا منہ بناتی ہے......''ناراض ہوں گے......''

''ناراض کیوں ہوں گے؟'' نریندر سوال کرتا ہے۔

''میں جا کر ددو کو بلاؤں؟'' مالو پوچھتی ہے۔

''ہو سکتا ہے بابو جی کو ہماری آواز سنائی ہی نہ پڑی ہو۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

''جاؤ مالو......ددو کو بلا لو۔''

مالو ہرّے کہتی ہوئی دوڑ جاتی ہے......

کمرے کا دروازہ کھلا ہے...... بوڑھا آئینہ کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے......سفید کرتا، سفید پائجامہ......اجلا شفاف چہرہ...... چہرہ پر وقت نے کچھ جھریاں بھی کھڑی کر دی ہیں — یہ چہرہ کس کا ہے...... یہ کون ہے......آئینہ کے سامنے کھڑا ہوا بڈھا......آں وہ زبان نکالتے ہیں۔ آئینہ بھی منہ چڑھاتا ہے......وہ ہاتھوں کو کان کے پاس لے جا کر لہراتے ہیں......

مالو دیکھتی ہے......تعجب سے۔

بوڑھا ہاتھوں کو ہلاتا ہے۔ مٹھیاں باندھتا ہے۔ آئینہ والا بوڑھا بھی وہی کرتا ہے۔ بوڑھا پھر منہ چڑھاتا ہے......آئینہ والا بوڑھا بھی منہ چڑھاتا ہے۔

بوڑھے کو اس کھیل میں مزہ ملنے لگتا ہے......

دروازہ سے مالو چیختی ہے......ددو......!

بوڑھا پلٹتا ہے......کون......؟

''ددو......''

مالو پاس آ کر بوڑھے کے ہاتھوں کو پکڑتی ہے۔''ددو، چلیے نا...... نیچے پر تیکھا ہو رہی ہے......کھانے پر......''

''آں......آں......''

بوڑھا آئینہ سے ہٹ کر منہ چڑھاتا ہے۔کانوں کے پاس لے جا کر ہاتھ ہلاتا ہے۔

''ددو......چلو نا......''

''کہاں چلوں......''

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو ددو......''

''دیکھوں گا......''

''مجھے ڈر لگتا ہے ددو......''

''تو بھاگو یہاں سے۔''

بوڑھا مارنے کو ہاتھ ہلاتا ہے۔مالو وہاں سے روتی ہوئی بھاگتی ہے......روتی ہوئی تیز تیز گھر کی سیڑھیاں اترتی ہے۔

''نریندر چونک کر پوچھتا ہے......''

''ارے کیا بات ہے مالو......رو کیوں رہی ہے؟''

''ددو نے بھگا دیا۔مارنے کو ہاتھ اٹھایا۔''

''کیا—؟''

نریندر اور اوما ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہیں۔

''تم نے کھانے کے لیے نہیں کہا؟''

''کہا...... مالو روتے روتے چپ ہو جاتی ہے۔'ددو تو آئینہ کے سامنے کھڑے تھے آئینہ کو منہ چڑھا رہے تھے۔''

''کیا بکتی ہے۔''نریندر نے ڈانٹا۔

''ہاں ڈیڈی۔ددو کو کچھ ہو گیا ہے۔ددو نے مجھے پہچانا نہیں۔''

اوما نے شک سے دیکھا......کہیں بابو جی کو کچھ......'

''کچھ کیا؟''

''آپ جا کر دیکھیے تو سہی—''

نریندر دوڑتا ہوا کمرے میں گیا تو اس وقت تک بوڑھا بستر پر گاؤ تکیہ کے سہارے اڑ کر بیٹھ چکا تھا۔

''باؤ جی—''نریندر نے پکارا۔

بوڑھے نے آنکھیں اٹھائیں۔پلکیں جھپکائیں......'کون نریندر؟'

نریندر کے پیچھے کھڑی اوما نے پلٹ کر مالو کو دیکھا۔

''آپ اچھے تو ہیں۔''نریندر گھبرا گیا تھا۔

''ہاں۔ٹھیک تو ہوں۔''

''لیکن مالو کہہ رہی تھی......''

بالمکند نے ٹھنڈی سانس بھری...... پتہ نہیں کیا ہوتا جارہا ہے۔کبھی کبھی سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ سامنے والا کون ہے؟ میں کون ہوں......کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

''چلیے کھانا کھالیجئے—''

نریندران کا ہاتھ پکڑ کر نیچے لے آتا ہے—

(۲)

کمرے میں پراسرار چپی تھی۔ چپی جو کسی طوفان کی اطلاع دیتی ہے—نریندر چپ تھا اور نلکانی اس کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔

''ابھی تک سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے۔ سنو نریندر، تم پر سب بڑی ذمہ داری ہے۔تم چپ رہتے ہو...... تمہیں غصہ بھی کم آتا ہے...... تمہاری آنکھوں میں دوسروں کو مسحور کرنے والی کیفیت موجود ہے...... ہمارے لیے ضروری ہے مسلمانوں اور ان کی الہامی کتابوں کو صحیح طور پر جاننا۔اب سنو جو میں کہہ رہا ہوں...... دلی میں ہونے والی اگلی دھرم سنسد میں یہاں کا نیتر تو تم کرو گے—''

نریندر صرف مسکاتا ہے—

''ایک بات پوچھوں—ڈھانچہ ٹوٹ گیا تو ہم مندر بنالیں گے۔اور مندر بن گیا تو...... گئو ہتیا بند کرنے کے سرکاری حکم کے بعد جن سنگھ جیسی ٹھپ ہوگئی تھی ویسا دن تو نہیں آئے گا؟''

نلکانی مسکرائے...... ''یہ بچوں جیسے سوال کیوں پوچھنے لگے نریندر ابھی تو کاشی ہے متھرا ہے۔اور باقی باتیں تو تم جانتے ہو......اب ہم کس آدھار پر لڑائی لڑ رہے ہیں۔ عام ہندوؤں سے لیکر بدھ جیوی کلاس تک— کیا سب تم کو ہمارے ساتھ نہیں دکھ رہے۔ ارے ہماری ریلیوں پر پرتیبندھ لگتا ہے۔تب بھی ہم ہی ہیرو بنتے ہیں فائدہ ہمیں ہی ہوتا ہے۔اور سرکار ہی الو بنتی ہے— تمہیں آشچر یہ نہیں ہونا چاہئے متھرا اور کاشی کے نعرے بھی آج کے نہیں۔۱۹۸۴ء میں پہلی دھرم سنسد میں ۷۶ پنتھ سمپر دایوں کے ۵۵۸ دھرم چاریوں نے حصہ لیا۔اسی میں پہلی بار رام جنم بھومی اور کاشی وشوناتھ مندر کی مکتی کا نرنئے لیا گیا—

''جانتا ہوں—نریندر دھیرے سے بولا—دھرم سنسد اور مارگ درشک منڈل دونوں ہی وشو ہندو پریشد کے سنگٹھن ہیں۔ دھرم سنسد اہم مسئلوں پر مارگ درشک منڈل کو صلاح دیتی ہے۔اس کے بعد مارگ درشک منڈل اسے منظور کر کے وشو ہندو پریشد کو سونپتا ہے۔''

نلکانی دوبارہ مسکرائے......اب جان گئے ہو گے کہ مارگ درشک منڈل کا ایک بڑا کام پورا ہو چکا ہے—دھرم سنسد میں لیے گئے پہلے اہم فیصلے پر آرایس ایس اپنی وجے کی مہر لگا چکی ہے—رام جنم بھومی وجے کے بعد اب کاشی اور متھرا کی باری ہے۔ یہ رتھ چلتا رہے گا، اس سمے تک، جب تک ہم شتابدی پرانی داستا کے اس وستر (لباس) کو اتار نہیں پھینکتے ہیں۔''

نلکانی مسکراتے ہیں......کام بہت سے کرنے ہیں۔ سمے کم ہے۔ ہمارے پاس شیگھر (جلد) پرکاشت کرنے کے لیے پبلیشر بھی ہیں ہم نے آدھونک اتہاس کی روپ ریکھا تیار کرلی ہے۔ مہینے دو مہینے یا سال بھر میں اتنی کتابیں بازار میں آجائیں گی کہ لوگ پرانے اتہاس کو بھول جائیں گے۔

''اس کے لیے کچھ نئے اتہاس گڑھنے بھی تو پڑیں گے۔''

''تتھاستو— مسکراتے ہیں نلکانی— ستیہ کی کھوج کے لیے کبھی کبھی ایسا کرنا پڑتا ہے۔ داس کو مکتی دلوانے کے لیے کبھی کبھی جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔اس لیے ہماری دھارمک کتابوں میں اس جھوٹ کو غلط نہیں کہا گیا ہے۔ جو سچ کا درشن کرنا چاہتا ہو اور ویکتی کو نرک سے مکتی دلاتا ہے۔ایسا جھوٹ ہزار سچ پر بھاری ہے۔''

''اب سنو'' نلکانی کی آواز ہوا کے دوش پر لہرا رہی تھی......ہم ہر کونے سے اٹھیں گے...... چپے چپے سے اٹھیں گے......ہم چاروں دشا

سے اٹھیں گے۔ ہم ندی، جل، سمندر، پہاڑ، چٹان، چاروں اور سے جٹیں گے...... ہم جٹیں گے ہم چپے چپے پر پھیلیں گے......اور ہم وجئ رہیں گے۔''

''مجھے نیل کنٹھ سے ملنا ہے۔''

''جاؤ— نیل کنٹھ کو شیو پوری مارگ پر ایک سبھا سمبودھت کرنا ہے— نلکانی مسکرائے— ابھی کل کا بچہ ہے— ہمیں اسے تیار کرنا ہے۔ اور ہاں سنو— تحسین کو ابھی زیادہ سامنے مت لاؤ— یہ دلی مہانگری نہیں ہے چھوٹا شہر ہے۔ بیچارہ مفت میں بدنام ہو کر مارا جائے گا— یہ ہمارے لیے دربھاگ کی بات ہوگی۔ ہمیں تحسین سے آگے بھی کام لینا ہے۔''

''ٹھیک ہے— چلتا ہوں۔''

''جے شری رام—''

نلکانی ہمیشہ کی طرح مسکرائے۔ نریندر کمرے سے باہر نکل گیا۔ نلکانی نے پہلی بار یہ احساس کرایا تھا کہ پارٹی کے لیے وہ کتنا اہم ہے۔ وہ بھی تو سارے کام دھندے چھوڑ کر ادھ کچھ دنوں سے بس پارٹی کے لیے ہی سمرپت تھا— وقت قربانی چاہتا ہے اور یہ قربانی دینے کے لیے انسان کو تیار ہونا پڑتا ہے۔ اگلی دھرم سنسد میں جانے کے لیے اس کو مانسک (ذہنی) سطح پر تیار ہونا تھا— اگلا مدعا......یعنی ۱۹۸۴ء کی پہلی دھرم سنسد کے نرنے کے لحاظ سے اب باری متھرا کے شری کرشن جنم بھومی کو مکتی دلانے کی ہے......اور نریندر کے لیے اس کا لٹریچر جاننا ضروری ہے۔ ممکن ہوا تو آدھونک (جدید) لٹریچر......آنکھوں کے آگے نلکانی مسکراتے ہیں...... داس کو مکتی دلانے کے لیے کبھی کبھی جھوٹ کا سہا لینا پڑتا ہے......اس لیے ہماری دھارمک کتابوں میں اس جھوٹ کو غلط نہیں کہا گیا ہے۔ جو سچ کا درشن کرنا جانتا ہے اور وکیتی کو نرک سے مکتی دلاتا ہو......

کام بہت ہے......اور نئی اسٹریٹجی تیار کرنے کی ذمہ داری کا کام— عوام کو صرف بات نہیں چاہیے۔ اتہاس چاہیے، گھٹنائیں چاہئیں۔ گھٹناؤں کی ستیاؤں (سچائی) کے لیے سن، تاریخ چاہیے۔ دماغ میں بیٹھانے کے لیے دلیلیں چاہئیں اور چاہیے جھوٹ پر جمے رہنے کی قلعہ بند سچائی۔

شیو پوری مارگ......تنبو لگا تھا— منچ پر نیل کنٹھ آسین تھا— بھگوا جھنڈے پھہرا رہے تھے، ماحول میں جے شری رام کی گونج مچی تھی— ٹیکا دھاری جوان، مرد، عورتیں اور بچے سبھا کی شوبھا بڑھا رہے تھے......جس وقت نریندر منچ کی طرف بڑھا، مائک پر نیل کنٹھ کی آواز گونج رہی تھی:

'ہم جیتیں گے
ہم جیتیں گے
تم دیکھو گے
ہم جیتیں گے
وشواس رکھو، ہم جیتیں گے
ہم ہر ایک منچ سے جیتیں گے
ہم چپہ چپہ جیتیں گے
ہم وادی وادی جیتیں گے......'

سموہ (بھیڑ) تالیاں بجا کر ابھی نندن کر رہی تھی— نیل کنٹھ ٹھہر ٹھہر کر اور سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔

''......اور آپ دیکھ رہے ہیں، سرکار بوکھلا گئی ہے۔ ہماری بڑھتی طاقت سے۔ ہمیں نیچا دکھانے کے لیے سرکار اپنی طاقت، اپنے بل بوتے کا ناجائز استعمال کر رہی ہے ارے سرکار کہتی ہے کہ ہم سامپردائیک ہیں۔ ہندوؤں کو کہتی ہے سرکار کہ سامپردائیک ہے کیوں کہتی

ہے......؟اس لیے کہتی ہے کہ بے چارے بھولے بھالے ہندوسوئے سوئے اب جا کر اپنا حق مانگنے کو تیار ہوئے ہیں۔ سرکار نے مسلمانوں کو کبھی سامپردائیک نہیں کہا، ان کے لیے سات خون معاف۔ کرسچن اور دوسرے لوگوں کو نہیں کہا، وہ زورزبردستی دھر پکڑ کر اپنے دھرم پر چار کا ابھیان چلائیں — ان پر سب معاف — لیکن اگر ہندو کریں، اگر ہندو اٹھیں تو وہ سامپردائیک — میں آپ کا ادھیک سمے نہیں لوں گا......
اب بھاجپا کے ایک پرکھ کاریہ کرتا نریندر شرما جی آپ کو بتائیں گے کہ ہمارے لیے بھوشیہ (مستقبل) میں کن کن چنوتیوں کا مقابلہ کرنا ہے۔

تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے بیچ نریندر مائیک سنبھالتا ہے — بس چند پرشن آپ کے سامنے — کچھ تتھیہ (حقیقت) رکھنے کی اجازت......اور......(مسکراہٹ) — وشو (دنیا) میں کیا ہو رہا ہے۔ اسلامی دیش جس طرح آپس میں مل کر ایک وشال طاقت بننے والے ہیں۔ کیا آپ کو کچھ اندازہ ہے۔ کیا ہوسکتا ہے بعد میں۔ اس کو چھوڑیے۔ کیا ہو رہا ہے اس کی ایک جھلک میں آپ کو دکھاؤں — ابھی حال میں ۲۸ نومبر ۹۲ء کو دس مسلم دیشوں نے مل کر ایک اسلامی سنگٹھن بنایا — ایشیا کا یہ حصہ بہت جلد ایک مہاشکتی کے روپ میں ابھر کر آپ کے سامنے آئے گا — ابھی حال ہی میں سوویت سنگھ میں ہونے والے بدلاؤ کا جائزہ لیں۔ سوویت سنگھ کے مسلم اکثریت والے راجیہ پرتھم وشویدھ (پہلی جنگ عظیم) کے پہلے ترک سامراج کا ایک حصہ تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکی کو ملنے والی ہار کے بعد روس ان دیشوں پر لگاتار حاوی ہوتا گیا اور دیشوں کو ہڑپتا گیا — لیکن کیا ہوا — ۱۹۹۰ء میں جب نیا اتہاس رچا گیا تو وہ علاقے چھ آزاد دیش کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک بڑا سچ یہ رہا کہ اتنے برسوں کے روسی شاسن (حکومت) کے باوجود نہ تو ان کی بھاشا بدلی، نہ دھرم نہ سنسکرتی۔ یہاں کے لوگ ترک نسل کے ہیں۔ اسلام ان کا دھرم ہے۔ اور سنسکرتی بھی ایک ہی ہے۔

اسلام والے جہاں رہتے ہیں، وہ اسلام کے اصولوں میں ہی بندھے رہتے ہیں۔ اور 'بٹوک' سا ہندو بیچارہ کوری دھرم نرپیکچھتا کے پیچھے اپنا ہندو منتر گنوا رہا ہوتا ہے۔ ادھر وشو میں اسلامی مہاسنگھٹن بنانے کی یوجنا چل رہی ہے......اور ادھر ہندو ایک مندر نہیں بنا پا رہا ہے — ایک ڈھانچہ ٹوٹتا ہے تو اسے اپنوں کے منہ سے شرم شرم جیسے شبد کو سننے کو ملتے ہیں۔

ذرا غور کیجئے۔ مٹھی بھر مغل شاسک آتے ہیں اور ہندو روند دیئے جاتے ہیں۔ انہیں جبرا مسلمان بنایا جاتا ہے۔ اسلامی مہاسنگھٹن کے ابھرنے کا مطلب ہوگا...... پورے وشو کی داستا، غلامی — خطرہ جتنا بڑا ہے، ہم اسے اتنا آنک نہیں پا رہے ہیں —

مسلمان بادشاہوں کو مندر توڑ کر مسجد بنانے کی مہارت تھی۔ اس کی ہمارے دیش میں ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ اب یہی دیکھیے......
کرشن جنم بھومی متھرا — کنس کے کاراگار میں ۳۱۶۸ (ق۔م) شری کرشن کا اوترن ہوا تھا۔ اس استھان سے انیک (بہت) براہمی شلا لیکھ اور دوسرے پراتتو یہ وشیش۔ پراپت ہوئے۔ جن سے پتہ چلا کہ ق۔م پہلی شتی میں شاڈاس نام کے شک واجہ کے کاریہ کال میں اس جنم استھان پر واسودیو شری کرشن کے ایک مندر کی بنیاد رکھی گئی — چوتھی شتی میں گپت سمراٹ چندرگپت وکرمادتیہ نے یہاں ایک وشال مندر بنوایا۔ چینی سیاح ہیون سانگ کے وقت بھی یہ مندر موجود تھا۔ جسے ۱۰۱۷ء میں محمود غزنوی نے توڑ وادیا۔ ۱۱۵۰ء میں راجہ وجے پال دیو نے دوبارہ اس جگہ پر کیشو کا ایک بڑا مندر بنوایا۔ اس کو سکندر لودی نے ۱۶ویں شتی میں توڑ دیا۔ بندیلا نریش ویر سنگھ جو دتو نے ۱۶۱۳ء میں اس جگہ پھر مندر بنوایا۔ اورنگ زیب نے ۱۶۶۱ء میں اس مہان مندر کو بھی دھاراشائی (برباد) کر دیا۔

ہم بناتے رہے، وے اجاڑتے رہے — سموچے وشو میں مسلمان دیش ایک دوسرے سے مل رہے ہیں اور یہاں ہم اب بھی آپس میں بکھرے پڑے ہیں۔ ہم اپنے مندروں کی واپسی چاہتے ہیں تو ہمیں دیش دروہی اور سامپردائیک تک کہا جاتا ہے۔

''تتھیہ آپ کے سامنے ہیں۔ نرنے آپ کو لینا ہے۔ کون سامپردائیک ہے؟'
نریندر مائیک سے ہٹا تو دیر تک تالیاں گڑگڑاتی رہیں۔ منچ کے ایک کونے میں خاموش خاموش تحسین بھی بیٹھا تھا —

●●

سبھا سماپتی کے بعد، تقریباً آدھے گھنٹے بعد ان کے باہر نکلتے ہی سدھیندورائے نے خبر سنائی، وہ اکبر پورہ کے پاس سے، ایک نکڑ سبھا سے آرہے تھے۔

سدھیندو رائے بولے—

''فضا پھر گرم ہوگئی ہے—''

نیل کنٹھ نے کہا— ''ہماری باتوں کا یہاں بھی اثر ہوا ہے—''

نلکانی ملے تو بولے— ''ایسی سبھائیں ابھی لگاتار ہونی چاہئیں اور جنتا میں داخل آکروش کو ہمیں نشچت طریقے سے کیش کرنا ہوگا—''

ہاں اس بیچ تحسین کا منہ سوجا ہوا تھا۔ جیسے اسے کوئی بہت بڑی قیمت چکانی پڑ رہی ہو۔

پولیس کے سائرن پھر شہر میں گونجنے لگے تھے۔

پولیس کے جوان چاروں طرف چھترا گئے تھے۔

اور ایک بار پھر دھیرے دھیرے شہر کی فضا بارودی رنگ اختیار کرنے لگی تھی۔

●●

''کل آپ کو کیا ہو گیا تھا؟''

نریندر پوچھ رہا تھا۔

''ہاں مجھے کچھ ہو گیا تھا؟ بالمکند نے خود سے پوچھا...... میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ جیسے دماغ میں کچھ رہا ہی نہیں۔ ایک دم سے خالی...... ہاں ایسا ہی تو لگا......''

''شام میں ڈاکٹر کے یہاں چلیں گے، نریندر کو تکلیف ہوئی۔ یہ اچھی بات نہیں ہے پتا جی— ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا؟''

''نہیں— پہلے کبھی نہیں ہوا۔''

''اور کیا لگتا ہے......؟''

''بس سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ یہاں تک کہ بستر کیا بلا ہے۔ تکیہ کیا ہے...... بیٹھا ہوا ہوں کہ کھڑا ہوں آئینہ کیا ہے۔ سامنے کون کھڑا ہے۔ کچھ بھی پہچان نہیں پاتا۔''

نریندر چپ ہو گیا۔

بالمکند بھی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

●●

کانگریس آفس اور ادھر ادھر چکر لگا کر انیل تھک چکا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ اب گھر واپس ہوا جائے۔ دن بھر کی باتوں کا جمع خلاصہ یہی تھا کہ کانگریس عوام میں اپنا اثر کھو رہی ہے۔ کم از کم مسلم ووٹ تو اس کے حصہ سے نکل ہی گئے۔ اب کانگریس جتنے بھی پینترے کر لے...... انیل کو بزنس کے نرم ہو جانے کا بھی اندیشہ تھا۔ اس پر بھی کانگریس کی چھاپ پڑ چکی تھی— کانگریس پارٹی دفتروں سے اسے بہت کام ملتا رہا تھا۔ اب سوال تھا، اگر کانگریس ستہ کھو دیتی ہے تب؟ وہ تو سیدھے گھاٹے میں آجائے گا— تب ان کے پاس کام ہی کیا ہوگا— زیادہ نہیں لیکن سیاست کی اتھل پتھل کو لے کر تھوڑا پریشان تو تھا ہی۔

گھر آیا تو تلسی کا منہ بنا ہوا تھا۔ بیگ میز پر رکھ کر وہ تلسی کی طرف مڑا۔

''ارے کبھی تو اچھے موڈ میں بھی رہا کرو۔''

''اچھا موڈ خاک ہوگا۔ تمہیں گھر کی چنتا کب رہی ہے۔''

''کیا ہوا؟''

''انیل کچھ پریشان سا ہوا—''

''باؤ جی طبیعت خراب ہے!''

''خراب ہے؟''

''نریندر ہی سب کچھ کرتا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ، باؤجی ناشتہ کھانا بھی نریندر کے ساتھ ہی کھاتے ہیں۔ خدمت کے لیے بھی اوما ہی تیار رہتی ہے۔''

انیل کا ماتھا ٹھنکا۔ ''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''راج نیتی کے آدمی آپ ہیں۔ آپ کو راج نیتی ہی نہیں سمجھ آرہی؟''

''نہیں—''

''باؤجی بیمار ہیں—بوڑھے ہیں......کبھی بھی......کچھ بھی ہوسکتا ہے......اس سوا کا ارتھ جانتے ہیں؟''

انیل کا ماتھا پھر ٹھن سے ہوا...... بڑھاپے میں ماتا پتا کے سیوا کا ارتھ؟

تلسی نے پھر منہ بنایا— ''اتنا بڑا مکان— جائیداد— بنک بیلنس— سب کچھ نریندر کا ہوگا—'' وہ تھوڑی اداس ہوگئی— مالو بھی ہے...... مالو کے بارے میں بھی باؤجی کو کتنی بار اوما سے کہتے سنا ہے......اس کے وواہ کے بارے میں پریشان مت ہونا—ارے، کبھی کبھار تو جا کر بابوجی کی خیر خبر لیتے رہیے۔ ڈاکٹر کے یہاں لے جانے کو کہیے—ورنہ جان لیجئے آپ کے حصے میں کچھ نہیں رہے گا—ہاں—'

وہ ٹھہری— 'اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ بابوجی کو تیار کیجئے کہ وہ اپنی زندگی میں ہی وصیت نامہ تیار کرالیں۔ آپ بڑے ہیں۔ آپ کا زیادہ حق ہونا چاہئے۔ آنکھوں کے سامنے وصیت تیار ہوگی تو باؤجی حق نہیں مار سکیں گے۔

تلسی نے پھر زور دیا— 'تم نہیں جانتے نریندر اور اس کی پتنی ہے۔ بہت چالاک—راج نیتی میں تم سے بھی دس قدم آگے—نریندر کو دیکھو...... سمے کی آواز پہچانتا ہے......اس کروٹ بھی سکھ......اس کروٹ بھی—''

''مطلب۔''

''ادھر باؤجی کی جائیداد ہے......ادھر بھاجپا آگئی تو اس کے وارے نیارے۔ تم تو مہا مورکھ ہو—''

مہا مورکھ کی بات انیل کو بری لگی۔ ''وہ کیسے؟''

''تمہیں راج نیتی کی سمجھ ہی نہیں ہے۔ اب کانگریس کا زمانہ نہیں ہے چاروں طرف بھاجپا کی طوطی بول رہی ہے۔ دیکھنا کل نریندر کا پلہ کتنا بھاری ہوگا— دھرم بھی ملے گا، پنیہ اور پیسہ بھی۔ جب کہ تمہارے حصہ میں کچھ بھی نہیں ہوگا— تم دھرم سے بھی جاؤ گے، دھن سے بھی اور جاگیر سے بھی—''

انیل چونک کر بولا۔ ''باقی باتیں ٹھیک ہیں۔ لیکن دل بدلو سدھانت کو میں نہیں مانتا۔ اب چاہے کانگریس رہے چاہے جائے—ایک بار جو لیبل لگ گیا سو لگ گیا—''

''وہی تو تمہاری مورکھتا ہے۔ راج نیتی میں دل بدلو کو گالی نہیں سمجھا جاتا۔ عزت اور آدر ملتی ہے— خیر— جیسی تمہاری اچھا۔ ویسے باؤجی کی خیر خبر ضرور لے لو—''

''ابھی لیتا ہوں—''

انیل تیزی سے باؤجی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

●●

''ہاں! یہ مجھے کیا ہوتا جارہا ہے برکت حسین تم اسے کیا نام دو گے، کیا سچ مچ یادداشت پر اثر پڑا ہے یا......''

''کچھ نہیں میاں۔ صبر رکھو۔ کچھ نہیں ہوا ہے تمہیں۔''

''نہیں کچھ ہوا کیسے نہیں ہے، برکت حسین۔''

بالمکند شرما جوش گہری اداسی میں کھوگئے...... ''بہت کچھ ہوا ہے......ہوا کچھ کیسے نہیں ہے برکت حسین— میں بھول رہا ہوں۔ یہی سب

سے بڑی حقیقت ہے۔لیکن جو بھولنا چاہتا ہوں۔ وہی نہیں بھولتا۔جن سے آنکھیں چرانا چاہتا ہوں وہی زخمی کر دیتے ہیں مجھے —''

چودھری برکت حسین پریشان ہو اٹھتے ہیں...... ''خدانخواستہ بلڈ پریشر وغیرہ تو چیک کراتے ہونا جوش میاں؟ شوگر، ڈائبٹیز وغیرہ کی شکایت تو نہیں میاں، اس عمر میں ہر پل خطرے کی گھنٹی بجتی رہتی ہے۔ہوشیار رہنا چاہئے اس عمر میں۔''

''اب ہوشیار کیا رہنا برکت حسین۔سانسیں ناطہ توڑ لیں، سو زیادہ بہتر — تمہیں یاد ہے۔تب کیا صورت ہوئی تھی ہماری۔پنجاب جل رہا تھا۔لاہور جل رہا تھا...... پورا ملک جل رہا تھا۔کیسے عجیب عجیب قصے تھے۔شک وشبہ کی کھائیاں تھیں۔لیکن یہی لگتا تھا، آزادی کے چراغ ادھر جلے، ادھر زخم بھرے۔اور اب۔برکت حسین! آسمان میں منڈلاتے ہوئے گدھ نظر آتے ہیں مجھے۔خوفناک گدھ......انسانی بوٹیوں پر لپکتے ہوئے — اور یہ بچے — ڈنڈا، بھالا، ترشول، بھانجتے ہوئے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں —''

چودھری برکت حسین آہ بھرتے ہیں — ''یہ سب...... یہ سب کیوں یاد کر رہے ہو جوش میاں۔ناحق خود بھی پریشان ہوتے ہو، ہمیں بھی پریشان کرتے ہو —''

آواز کمزور پڑ جاتی ہے۔''کیا کہوں......اپنا آپ نکالنے والا بھی تو کوئی ہو۔درد بانٹنے والا — تم آجاتے ہو تو دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل جاتا ہے برکت حسین — کیا کیا دیکھ رہا ہوں۔بالائی منزل پر جاتا ہوں تو آسمان پر دھواں ہی دھواں نظر آتا ہے۔شفق کی سرخی ایسے دکھتی ہے کہ جیسے انسانوں کا خون مل دیا گیا ہو۔اور......سب کچھ ختم ہوتا نظر آتا ہے — سب کچھ —''

برکت حسین کی آنکھوں میں ایک قطرہ طوفان مچلتا ہے۔'یار جوش میاں، کبھی کبھی پرانے ساز چھیڑ کر رلا دیتے ہو تو تم بھی۔آخر کیا سننا چاہتے ہو تم۔کیوں یہ گلے شکوے لے کر بیٹھ جاتے ہو......تم اخلاق اور تہذیب کی ان نسلوں کی آخری کڑی ہو — سمجھے آخری کڑی۔اس کے بعد اس ملک کا خدا حافظ۔ہم نہیں ہوں گے، اور یہی سوچ سوچ کر دہشت ہوتی ہے کہ یہ ملک کن لوگوں کے ہاتھوں میں چلا جائے گا — یہ پرانی تہذیب کن لوگوں کے پاس گروی رکھیں گے۔ہماری خوف محنت سے سینچی گئی آزادی کا کیا ہوگا —''

چودھری برکت حسین کی آواز لرز جاتی ہے......

جوش صاحب نظر اٹھاتے ہیں...... یہ کتابیں دیکھ رہے ہو، قلم، کاغذ، دوات، اب کچھ بھی چھونے کی، اٹھانے کی خواہش نہیں ہوتی...... باہر شور ہے۔اپنے ہی بچے نظر پھیرے ہوئے لگتے ہیں۔دوسروں کو کیا کہوں...... باہر دھواں ہے...... جنگ کے جراثیم گھلے ہیں۔کس سے کہوں۔کس سے فریاد کروں۔اور یہاں۔میرے یہاں...... پرکھوں کی میراث یہ گھر...... یہ گھر بھی ٹوٹنے کو لگتا ہے۔

برکت حسین چونکتے ہیں۔

''میں مطلب نہیں سمجھا جوش میاں —''

''اب تم جان گئے ہوگے۔میرے دو ہی بچے ہیں۔لیکن ایک مشرق ہے۔دوسرا مغرب ہے۔ میں جانتا ہوں مشرق اور مغرب کو ملانے کی کارروائی بے سود ہے میاں۔اس لیے اب تھک کر بیٹھ گیا ہوں — ان کی باتیں سنتا ہوں، ان کی آپسی جھڑپ دیکھتا ہوں، ان کے درمیان بڑھتی دوریاں دیکھتا ہوں۔پھر خیال آتا ہے اس گھر کا...... پرکھوں کی میراث اس گھر کا......تو اس گھر میں ایک دراڑ دکھتی ہے مجھے — ایک خلیج نظر آتی ہے — گھر درمیان سے بٹا نظر آتا ہے۔یہ محض خیال نہیں ہے برکت حسین یہ آنے والے کل کی سچائی ہے۔وہ مجھ سے بولتے نہیں ہیں۔ابھی ظاہر نہیں کرتے۔مگر جب میرے پاس آتے ہیں تو میں ان کے ہونٹوں پر تھرکتی ہوئی خاموشی میں اس سچ کو پہچان لیتا ہوں۔ دراصل وہ بٹوارے کے خواہش مند ہیں۔''

''کیا کہتے ہو جوش میاں —''

''ہم بوڑھے ہو چلے ہیں۔برکت حسین بچے سب اسی بات کا احساس کرانا چاہتے ہیں...... کہ بوڑھے آدمی کے حصے میں ایک موت ہوتی ہے۔موت جو اگلے پائیدان پر کھڑی ہوتی ہے......اور اس پائیدان پر قدم رکھنے سے پہلے بوڑھے کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں جاگیر، جائیداد، اور مکان کا وصیت نامہ بھی تیار کرالے......مگر اس سے پہلے......''

جوش صاحب کے لب کانپے......

''میں ایک بیان دینا چاہتا ہوں......ایک ضروری بیان......''

''کیسا بیان؟''

''کئی دنوں سے دماغ میں اتھل پتھل ہے۔مگر وصیت کرنے سے پہلے......مرنے سے پہلے......''

آواز کئی بار ٹوٹی......کئی بار سنبھلے بال مکند جوش پھر نظر نیچی کر لی۔

''لیکن میں بھی تو سنوں جوش میاں۔''

جوش صاحب نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''ابھی نہیں۔ابھی وقت نہیں آیا ہے۔''

کہہ کر خاموش ہو گئے— مگر آنکھوں کے آگے جیسے لگاتار خونی رتھ یاترائیں گزرتی رہیں—

(۳)

وہی کمرہ......کبھی کبھی خود سے باتیں کرتے ہوئے کسی پراسرار چہرے کی طرح تکنے لگتا ہے......

''کون ہو تم؟ پہچانتے ہو خود کو......؟''

''نہیں—''

وقت کی دھمک سنو میاں۔ یہ نگاڑے کیا کہتے ہیں۔ ذرا آواز تو دو۔ کان لگاؤ۔ اور سنو...... یہ قت کی سوئیاں اب کہاں جا کر ٹھہرتی ہیں...... بالمکند شرما جوش...... یہ نئے زمانے کے بچے ہیں...... یہ تمہارے وقتوں کی کھونٹ سے نہیں بندھے...... یہ آزاد ہیں، خود مختار ہیں......

''میں کون ہوں......اور یہ سب......''

کمرہ اچانک اوجھل اوجھل سا دکھنے لگتا ہے......سب کچھ مدھم مدھم...... کسی کو پکارنا چاہتے ہیں......آواز لگانا چاہتے ہیں......ٹھہر جاتے ہیں......دھواں دھواں سا منظر......مشاعرہ چل رہا ہے...... بالمکند شرما جوش کا نام پکارا جاتا ہے۔ وہ شیروانی درست کرتے ہیں۔ چم چماتی شیروانی اور چمچماتا سفید رنگ چہرے مہرے سے ہمیشہ کشمیری لگے...... جوش صاحب کلام پڑھنا چاہتے ہیں......لیکن......نعتیہ کلام کی فرمائش ہونے لگتی ہے—

نعتیہ کلام......وہ بھی ایک ہندو کے منہ سے......

''ارے پڑھیے نا، جوش صاحب''

''واہ بھئی کیا نعت لکھی ہے۔''

''نعت میں تو جوش صاحب کا جواب نہیں......''

''انہی کے دم سے تو رونق آجاتی ہے مشاعرے میں......''

اور وہ پانچ چھوکرے، پانچ پاپی، بس پانچ قدم کے فاصلے پر ہیں......مسکراتے ہیں......طنز سے شاید...... جوش صاحب کو کچھ ایسا ہی لگتا ہے......ہوٹ کر رہے ہیں......کرو میاں......اچھا لگتا ہے......

''واہ......''

اور یہ پانچ پاپی تھے، شہر کے پانچ بے روزگار مسلمان لڑکے...... پانچوں شاعر...... پانچوں انہیں گھیرے رہتے ہیں......وہ اس چوکڑی کو پانچ پاپی ہی کہتے۔ نئی نسل ہے، نئی نسل والوں کی بات بھی سننی چاہئے، انہیں ہمیشہ سے اس کمپنی میں مزہ آیا—ان پانچ پاپیوں کی کمپنی میں......

شیخو میاں رنگریز کا لڑکا، فیض سقراطی — ان لڑکوں کو انوکھا سا نام رکھنے میں بھی مزہ آتا ہے۔ فیض سقراطی، بنا مشاعروں میں اکڑتا پھرتا ہے۔ ایک نمبر کا بقراط۔ بی اے فیل احمد ربانی — حبیب تنویر، نازاں خیال اور باقر مرزا — ان میں سب بے روزگاری کے ترشول پر لٹکے ہیں اور شاعری، ان کا محبوب مشغلہ ہے —

یہ پانچوں پاپی اچانک کسی کونے سے ان کے سامنے آجاتے ہیں...... ''مشاعروں میں یہ نعت آپ کیوں پڑھتے ہیں جوش صاحب — ''، فیض سقراطی پوچھتا ہے۔

''حبیب تنویر خود کو ترقی پسند کہتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے۔ جانتے ہیں یہ مشاعروں کے لوگ آپ سے نعت کیوں سننا چاہتے ہیں۔ کیونکہ آپ ایک ہندو ہیں اور آپ نے۔''

وہ بچوں کی سنتے ہیں...... بچوں کی صاف گوئی میں انہیں مزہ ملتا ہے۔ تبھی تو ان بچوں کو سگے بچوں سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں...... وہ کیا جانیں کہ نعت کہنا کتنا مشکل کام ہے۔ غزل کو تو ان لوگوں نے حالاتِ حاضرہ سے جوڑ کر بکاؤ اور بازارو بنادیا ہے۔ ہمارے وقت میں غزل کا کیا عالم تھا۔ ایک ہی طرح پر پورا شہر مغز ماری کرتا تھا۔ دیکھنا یہ ہوتا تھا کہ اس گرہ پر ہم کیسے اشعار کہتے ہیں۔ فلاں استاد نے اس طرح کو کیسے نبھایا تھا۔ تب غزل ایک شاندار اور رشک آمیز تہذیب کا ایک حصہ تھی — مثنوی لکھی جاتی تو بادشاہِ وقت کے قصیدے بیان ہوتے...... یہ تو ایک تہذیب کا حصہ تھا۔ دیکھنا یہ بھی ہوتا تھا کہ فلاں شاعر اصناف سخن کے کس کس صنف میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ نعت بھی تو اسی مشق کا ایک حصہ ہے۔ مگر یہ بچے......''

وہ سنتے ہیں۔ مسکراتے ہیں...... بولنے اور ابلنے دیتے ہیں بچوں کو......

''انہیں لوگوں نے......' حبیب تنویر کو غصہ ہے...... ادب کو چند جانوروں کا نوالہ بنا رکھا ہے —''

''چلو میاں۔ اپنا ادب اپنے پاس رکھو تم۔ اور سناؤ زندگی کے اصل امتحان کی کون کون سی تیاریاں چل رہی ہیں —''

'ناکامی — باقر مرزا ہونٹ چباتے ہیں — ''بس جوش صاحب اس سوال پر مت آئیے...... کہ ہم کیا کر رہے ہیں...... ابھی اس وقت یہ سوال ہمارے نزدیک کسی پستول کی گولی سے کم نہیں ہے —''

نازاں خیال آہ بھرتا ہے۔ جوش صاحب سوال تو ہمیں ملی ہوئی تعلیم کا بھی ہے۔ یعنی ہم...... ہم پانچوں جہاں سے آئے ہیں وہاں جن اسکولوں کا منہ دیکھنا نصیب ہوا، وہ سرکاری تھے — انہیں چھوڑیے تو سیدھی بات کہتا ہوں، جیسی تعلیم چاہئے تھی، ویسی ہمیں نہیں ملی۔ دوسروں کے مقابلے کافی پچھڑے ہوئے ملتے ہیں ہم...... اور امتحان میں پہلے سے ہی ہمارا ریزلٹ آؤٹ رہتا ہے —

احمد ربانی ہنستا ہے۔ شاعری نہ ہوتی تو ہمارے جینے کا کوئی مقصد ہی نہ ہوتا۔ آج اور کل پر تبصرے، نکتہ چینی اور شاعری، اس کے سوا ہم کر ہی کیا سکتے ہیں......'

جوش صاحب جاتے ہوئے ان پانچ پاپیوں کو دیکھتے ہیں اور پھر سے اپنے کمرے کی خاموشی میں پناہ ڈھونڈھ لیتے ہیں......

وہ کون ہیں...... مشاعرہ...... یہ کمرہ......

یہ سب کیا تھا؟

زندگی کے یہ کیسے رنگ ہیں...... ایک طویل زندگی سے اکتا کر وہ تھک چکے ہیں۔ ہنسی، قہقہے، سب بے معنی...... مالو کی ہنسی بھی اچھی نہیں لگتی اب...... گھر بھر پرایا سا لگتا ہے...... پھر کھو جاتے ہیں...... مالو کون......؟ انیل نریندر کون......؟ نہیں — وہ ڈر گئے ہیں — فضا سے...... ماحول سے...... اپنے آپ سے...... اپنے گھر سے...... اور......

''بابو جی...... آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا؟''

انیل ان کی آنکھوں میں جھانک رہا ہے......

سب مصلحت پسند...... وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔

''ڈاکٹر کے یہاں چلیے گا......؟''
اس کی آواز میں کمزوری چھپی ہے۔
''نہیں— ٹھیک ہوں۔''
''کبھی ہمیں بھی— سیوا کا اوسر (موقع) دیا کیجیے۔ تلسی کہہ رہی تھی۔ جانے کیا بات ہے بابو جی ہم سے ناراض رہتے ہیں۔''
وہی کمزور آواز— وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہیں۔
''غلط فہمی ہوئی ہے ناراض کیوں ہونے لگا بھلا۔''
'تو اسے بھیج دوں۔ سر میں تیل ڈالنے کے لیے کافی خشکی جھلک رہی ہے۔'' انیل کو موقع مل گیا—
''نہیں—''
آواز برف کی طرح یخ ہے—
''نہیں کیوں بابو جی؟''
''بوڑھا آدمی اپنی خواہشوں کا غلام ہوتا ہے۔ یہ ہاں اور نہیں اس کے موڈ کے تابع ہوتے ہیں...... سمجھ رہے ہو...... نہیں نا— جب مرضی ہوگی بلالوں گا۔ ہاں کچھ کہنا ہو تو کہو—''
''جی......''
انیل اٹک گیا ہے......
''کوئی بات نہیں۔ صاف صاف کہو......''
انیل ان کا چہرہ پڑھ رہا ہے...... لیکن— کیا پڑھ پائے گا— بھلا؟
وہ۔ آپ جانتے ہیں...... میں...... اتنا بڑا کاروبار پھیلا رہا ہوں...... جانتے ہیں نا......''
''نہیں—'' وہ دھیرے سے مسکراتے ہیں۔
انیل چونکا۔ ''نہیں جانتے ہیں۔''
''آگے کہو—'' چہرہ سپاٹ ہے۔
''اب کیا کہوں...... بزنس کے لیے، بزنس بڑھانے کے لیے...... پیسہ بھی تو چاہیے...... آپ کے بعد......''
وہ کہتے کہتے اٹک گیا ہے...... جیسے غیر ضروری سی طور پر یہ جملہ اس کے منہ سے نکل آیا ہو...... آپ کے بعد کیا؟ بابو جی کو برا بھی تو لگ سکتا ہے...... نہیں۔ وہ غلط کہہ گیا......
''میرا مطلب ہے......''
وہ مسکراتے ہیں...... دبی۔ الجھی مسکراہٹ......
''کہو...... کہو...... مجھے لگتا ہے نریندر بھی وہی کہنا چاہتا ہے، جو تم......''
''کیا نریندر بھی آپ کے پاس آیا تھا؟''
''ہاں''
''باؤ جی میں...... دراصل......''
''تم لوگ میری زندگی میں بٹوارہ چاہتے ہو...... یہی نا، گھر، جاگیر اور جائیداد کا۔''
ان کی آواز بھاری ہوگئی ہے۔ یقین رکھو۔ ابھی نہیں مر رہا ہوں میں اور مرنے سے پہلے......
''تلسی کو بھیج دوں بابو جی...... تیل لگانے کے لیے...... خشکی۔''

ان کے چہرے پر ورم آ گیا ہے—

''نہیں۔رہنے دو۔ابھی شانتی چاہتا ہوں......''

انیل چلا گیا— اندر باہر کمزوری کی ایک لہر چل پڑی ہے...... جیسے سمندر میں جوار بھاٹا آتا ہے۔لہریں شور مچاتی ہیں...... ویسا ہی جوار بھاٹا...... بچے اب گھر توڑنے میں لگے ہیں...... بٹوارہ چاہتے ہیں...... کتنے پیوند لگیں گے اس گھر کو......؟ کتنے پیوند......

جوا بھاٹا کا شور جیسے ہر پل ذہن پر پتھر مارر ہا ہے۔ان سب سے بچنے کے لیے اخبار اٹھاتے ہیں......خبروں پر نظر دوڑتی ہے۔پھسلتی ہے۔آگے بڑھتی ہے اور جیسے حیوانیت اپنا ننگا رقص شروع کر دیتی ہے......نہیں......اور نہیں......اور نہیں......ریڈیو کھولتے ہیں...... ٹی وی آن کرتے ہیں......اور...... وہی ریلیاں، بند، آندولن، ہڑتالیں......اور موت......ان گنت موت......ان گنت......سانحے، حادثے...... وقت کے حاشیے پر کوئی آتنک وادی کھڑا ہے...... ہاتھ میں اسلحہ لیے......وہ چیخ رہا ہے......اور گولیاں برسا رہا ہے......

نہیں......

وہ زور سے چیخ مارتے ہیں...... بچے...... بہو......دوڑے دوڑے آتے ہیں......مگر...... یہ سب کون ہیں......سب کے چہرے......بس دھواں دھواں......جھل مل جھل مل کر رہے ہیں......

کون ہو تم لوگ......وہ پہچان نہیں پا رہے ہیں...... بچے پریشان ہیں......وہ خوفزدہ سے بچوں کی طرف دیکھے جا رہے ہیں......

(۴)

شہر میں پولیس سیکوریٹی بڑھا دی گئی ہے— ایک انجان سا خطرہ ہر جگہ، ہر گھر میں محسوس کیا جانے لگا ہے۔شہر میں ہونے والی سبھاؤں اور دستخط ابھیان سے بھی لوگوں کے اندر بدلاؤ، آیا ہے۔ پولیس انتظامیہ اس خطرہ کو بھانپ رہی ہے۔اسی لیے شہر میں پولیس کی گشت بھی بڑھا دی گئی ہے۔ادھر دکانیں ۹۔۸ بجے تک کھلی رہتی تھیں۔انتظامیہ کے نئے حکم کے مطابق اب دکانیں ۷ بجے شام سے بند کر دی جاتی ہیں۔

شام سے ہی شہر، شہر خموشاں جیسا منظر پیش کرنے لگتا ہے......اُجاڑ، ویران، سنسان— کم سے کم چلتے ہوئے لوگ...... یکا دکا گزرتی ہوئی گاڑیاں......ان میں زیادہ تر ہارن دیتی گاڑیاں پولیس کی ہی ہوتی ہیں— یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ مسلمان زیادہ ڈرے ہوئے ہیں۔ مسجدوں تک جانے والے مسلمانوں کی تعداد میں بھی کمی ہوئی ہے......ایسے بھی مسلمان ہیں جو کرائے دار کے طور پر ہندو کے یہاں رہ رہے ہیں تو انہیں ایک انجانا سا خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔خطرہ یہ نہیں کہ ہندو مالک مکان مار ڈالے گا، خطرہ مکان کو بھی ہے کہ ان کے یہاں مسلمان کرایہ دار کیوں ہے؟ وہ منع کرتے ہیں کہ آپ کے یہاں داڑھی والے لوگ نہیں آنے چاہئیں۔زور سے سلام علیکم اور خدا حافظ کی آوازیں باہر تک نہیں پہنچنی چاہئیں۔اس سے آپ بھی خطرہ میں پڑ جائیں گے اور ہم بھی۔

بڑے بوڑھے لوگ اپنے اپنے زمانے کو یاد کرتے ہیں، تقسیم کے واقعہ سے اس عہد کو جوڑتے ہیں۔یاد کرتے ہیں کہ تقسیم وطن کے وقت بھی اس شہر میں کبھی فساد کی نوبت نہیں آئی تھی مگر اب— یعنی حالات تقسیم سے زیادہ برے ہیں۔کم از کم ان کی باتیں تو یہی اشارہ دیتی ہیں۔

اور ادھر پانچ پاپی ہیں۔شہر کا ایک پرانا سا ہوٹل ہے......ایک میز پکڑ لیتے ہیں اور تبصرے شروع ہو جاتے ہیں۔ان پانچوں کی الگ الگ محبوبائیں بھی ہیں۔ ہوٹل میں آنے اور چائے پینے تک محبوباؤں کو لے کر ہنسی مذاق ہوتے ہیں، پھر سنجیدگی کے کفن اوڑھ لیے جاتے ہیں— ''کیا ہوگا'' کا خوف بہت زیادہ ہے......اس خوف کے پانی پر کاغذ کی کمزور ناؤ چلتی کم اور اپلاتی زیادہ ہے۔

حبیب تنویر کو اس کے دوست ترقی پسند کہہ کر چڑھاتے ہیں۔وہ سنجیدہ ہوتا ہے۔

''فضا میں بارود ہے اور گھر میں مصلّی بچھ رہے ہیں......مسجد میں جانے والے نئے لڑکوں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ ہندوؤں میں بھی نئی نسل کے ساتھ یہی ماجرا ہے تھک ہار کر عام ذہن نے کیا مذہب کے دقیانوسی لبادہ کو قبول کر لیا ہے؟''

''اپنا ایمان اپنے پاس رکھو۔لیکن ہمیں کیوں کافر بناتا ہے۔نازاں خیال ہنستا ہے —''

اِن پانچوں پاپیوں میں کوئی انفرادیت نہیں تھی۔ جو ان کی خاص شناخت بن سکتی ہو۔ نہ ان کا ڈیل ڈول، نہ ان کا لہجہ — یہ پانچوں کسی بھی مسلمان محلے یا گھروں میں مل جائیں گے...... جو بے روزگار رہوں اور جنہیں شاعری کا شوق ہو گیا ہو......اور جن کی ایک عدد محبوبہ ہو —

''خبر کیا پوچھتے ہو —'' نازاں خیال اجودھیا سے ہو کر آیا ہے...... وہ خبر دیتا ہے......اجودھیا، فیض آباد سڑک پر جگہ جگہ ٹوٹے ہوئے میناروں کے ٹکڑے ابھی تک جوں کے توں پڑے ہیں — کوٹیا، قضیانہ اور ٹیڑھی بازار کے تباہ شدہ مکان دوبارہ تعمیر ہو رہے ہیں۔ ریلیف کیمپوں سے مسلمان اب واپس آنے لگے ہیں۔لیکن برپا ہونے والی قیامت کا اثر سب کے چہرے پر ہے — کتنے ہی لوگ شہر چھوڑ کر محفوظ علاقوں میں بھاگ چکے ہیں — جو واپس آتے ہیں، انہیں گھر اور جائیداد کا موہ کھینچ لایا ہے۔حقیقت ہے آج اور کل، انہیں اپنا کچھ بھی محفوظ نہیں لگتا — مسلمانوں کا یقین اور اعتماد سب سے اٹھ گیا ہے — ایک سوال اور بھی ہے جائیں تو کہاں جائیں — شانتی بحال ہونے پر یہی سوال انہیں پھر سے اپنی تباہ شدہ چوکھٹ سے باندھ دیتا ہے —

وہیں ایک منو بابو ہیں۔ ۸۷ سالہ انصار حسین۔ ۱۹۳۴ء میں جب مسجد پر حملہ ہوا اور مسجد کے تینوں گنبدوں کو نقصان پہنچا، تب بھی یہ اس واقعہ کے چشم دید گواہ تھے۔ ہندو مسلمان اتحاد کے ایک ستون — ایک مندر ہے جس کی نگرانی کا کام انہیں کے ذمہ ہے۔ منو بابو کو یقین تھا، ہر طرف ان کی قدر و منزلت ہے۔انہیں کچھ نہیں ہوگا۔مگر ہوا کیا۔کارسیوکوں نے ترشول کے بل پر انہیں بھی زیر کرنے کی کوشش کی —

ایک محلّہ ہے کٹرہ — وہاں مسلمانوں کے بہت سے مکان تھے۔ شناخت کے لیے ان کے دروازوں پر کراس کے نشان بنا دئے گئے۔ حادثہ کے روز سب نے اپنے اپنے دروازوں پر جے شری رام، لکھ دیا۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کے مکان کے پہچان میں آسانی ہوگئی — اور چن چن کر مسلمانوں کے مکان میں آگ لگائی گئی۔

مزار اجڑے پڑے ہیں۔ پانی ٹولہ کے قبرستان کو مرکز نے ایکوائر کر لیا ہے۔ قبریں کھدی پڑی ہیں۔ درگاہ پر حملے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اب بھی لوگ ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔ مگر وہ پہلے والی بات تقریباً ختم ہوئی لگتی ہے —

فیض سقراطی کہتا ہے:

جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ مسجد ٹوٹ گئی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں مسجد مت کہو۔ ڈھانچہ کہو۔ میرا پہلا اعتراض تو اسی بات پر ہے۔ وہ مسجد تھی، آخری وقت ٹوٹنے سے قبل تک وہ مسجد تھی تو اسے مسجد ہی کہا جائے گا۔ حکومت نے وہائٹ پیپر جاری کیا اور الزام سے بری ہوگئی اور وہ لوگ جو فخر سے کہتے ہیں کہ یہ میری فوج نے کیا۔ ان پر قانون کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی...... وہ آزانہ گھومتے رہتے ہیں۔

احمد ربانی کو غصہ تھا...... کچھ لوگ مسلم پرسنل لا پر غصہ نکالتے ہیں۔ آخر کیوں ہندوستان میں صرف مسلم پرنسل لا ہی تو نہیں ہے، جین پرسنل لاء، بدھسٹ پرسنل لا اور ہندو کوڈ بل بھی تو ہے۔

نازاں خیال نے اعتراض کیا۔'یار، یہ پورا میڈیا ہی ان کا کام کر رہا ہے۔ اس لیے ان بے کار باتوں پر بحث کرنے سے فائدہ نہیں۔ فی الحال چائے پیو اور سوچو۔ شعر و شاعری سے آگے نکل کر ہماری پلاننگ اور کیا ہونی چاہئے —'

باقر مرزا نے چائے کی چسکی لی — 'ہمیں خود ایک پریس نوٹ ریلیز کرنا چاہئے۔ جس میں ہم صاف طور پر مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے فیصلہ لیں کہ ہمیں مسجد نہیں چاہئے —

''لیکن تمہیں تو نمائندہ بنایا کس نے؟''

''کسی نے نہیں — ہم خود بنیں گے — اب اندھیرے سے نکل کر ہمیں بھی تو سامنے آنے کی ضرورت ہے......''

''کیوں نہیں، کیوں نہیں، حبیب تنویر نے مذاق اڑایا۔ مسلم رہنمائی بس چراغ لے کر آپ ہی کا انتظار کر رہی ہے...... ویسے کہاں چھپے ہوئے تھے اتنے دنوں تک آپ۔''

''یار مذاق مت کرو۔''

''یہ مذاق نہیں تو اور کیا ہے۔ مسلم رہنمائی کے لیے، یہ مسلم لیڈر کم پڑ گئے ہیں جو آپ رہنمائی کا فرض سنبھالیں گے — اور ہماری اوقات کیا ہے...... ایں...... وہ کیوں آپ کی بات مانیں گے......''

''مت مانیں، جائیں بھاڑ میں۔''

''بھاڑ میں صرف وہ نہیں۔ ہم سب جانے والے ہیں — بات رہنمائی کی نہیں ہے...... بات ہے کہ اگر دوبارہ مسجد بننے کی بات اٹھتی ہے تو ہم بھی چین سے نہیں رہیں گے اور تلوار ہم پر ہی ٹوٹے گی — اس لیے......''

''ہاں یار یہ ٹھیک ہے۔ اس لیے کہ صرف شعر و شاعری سے مسئلہ حل نہیں ہوگا اس سے زیادہ اب میدان میں اترنے کی ضرورت ہے۔ ہم صرف پانچ، چھ یا چند لوگ نہیں ہیں۔ ہمارے جیسے سوچنے والے اور بھی ہے جو فساد نہیں چاہتے۔ دنگا نہیں چاہتے — جو چین اور سکون سے رہنا چاہتے ہیں۔ ہم یہی چاہتے ہیں کہ وہاں مندر بننا ہے تو ایک بار بن جائے — کیوں؟''

چائے خالی ہو چکی ہے اور چائے کی خالی گلاسوں پر مکھیاں بھی بھنبھنانے لگی ہیں۔ وہ سر جوڑے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ پھر کرسی سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

●●

زمانہ بدل گیا، اکبر پورہ میں پہلے ایک قطار سے رنگ ریزوں کی دکانیں ہوا کرتی تھیں۔ ساڑیاں چھپ رہی ہیں۔ الگ الگ چوکیاں پڑی ہیں۔ لکڑی کے موٹھے ہیں اور انہیں رنگوں میں ڈبا دبا کر پلین ساڑیوں پر گل بوٹے کھلائے جا رہے ہیں۔ پہلے عام گھروں میں اس طرح کی ساڑیوں کے رواج خوب تھے تو رنگ ریز بھی تھے۔ لیکن جیسے وقت کے ساتھ بہت سے پیشے حالات کے نذر ہو گئے، رنگ ریزوں کو بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ اب تو مارکیٹ ہے، شوروم ہے، ایک سے ایک دکانیں ہیں۔ کپڑوں کی میلیں ہیں — مفت لال، بمبے ڈائنگ، بنی اور دنیا بھر کی کمپنیاں ہیں۔

اکبر پورہ، رنگریزوں کا یہ مارکیٹ اب پرانے وقتوں کی کہانی ہے۔ اب یہ علاقہ نے شوروم سے بھرا پڑا ہے۔ ہاں ابھی بھی دو ایک رنگریز کی دکانیں موجود ہیں اور اکا دکا گاہک بھی کبھی کبھی چلے آتے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک دکان ہے شیخو میاں رنگریز کی۔ فیض سقراطی شیخو میاں رنگ ریز کا ہی لڑکا ہے — عمر کے یہی خطرناک پڑاؤ ہوتے ہیں۔ جب بھٹکتے ہوئے نوکری کے لیے دوڑتے ہوئے قدموں پر آوارگی کا خیال آتا ہے —

شیخو میاں بھی چاہتے تھے، فیضو کا یہ اسطرح دوستوں میں اٹھنا گھومنا بند ہو۔ ارے جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا۔ نوکری مل جائے تو ٹھیک ہے۔ جب تک نہیں ملتی، اس خاندانی دھندے میں شامل ہو جائے۔ دو پیسے تو بنیں گے ہی۔ دو پیسوں سے گھر کا کتنا بڑا سہارا ہو جائے گا — وہ کبھی کبھی اپنی قسمت کو کوستے ہیں — کون سا پاگل پن سوار ہوا تھا جو بچے کو پڑھانے لکھانے اور بڑا آدمی بنانے کا خیال آیا تھا — میاں تو...... وہ جو کہتے ہیں...... اب سیرا اور گانے بھی لکھنے لگے ہیں...... لیکن گانوں سے پیٹ تھوڑا ہی بھرتا ہے —''

''ابا کہتے ہیں، ان کا خاندانی پیشہ اپنا لوں —''

''ہم مسلمانوں کو سرکاری نوکری بھول جانی چاہئے —''

حبیب تنویر ڈانٹتا ہے — ''سالے محنت نہیں کرتے۔ سرکاری اسکولوں میں پڑھ پڑھ کر سمجھتے ہو سرکاری نوکری بھی مل جائے گی۔ میاں اس کے لیے کانونٹ اور انگریزی اسکولوں میں پڑھنا پڑتا ہے —''

نوکری؟

محبوبہ سے زیادہ ایک حسین خواب تھا ان کے لیے۔

یہ خواب تڑپاتا تھا، چھیلتا تھا اور پریشان کرتا تھا — کبھی کبھی یہ مشاعروں اور اپنی اپنی شاعری پر جی بھر کر بھڑاس نکالا کرتے۔ ''ان سے

کوئی فائدہ نہیں...... جی چاہتا ہے انہیں ختم کردوں...... یہ کچھ نہیں دے سکتے—''

پھر سر جھکا کر بیٹھ جاتے—

آپس میں پیسے جوڑتے اور چائے والے کو پیسے ادا کرکے اداس اداس سے گھر لوٹ پڑتے—

(۵)

چودھری برکت حسین کے لیے منا کا یہ روپ بالکل نیا تھا۔ کہاں ساڑھے چھ بجتے بجتے بھوکا پیاسا آفس سے جلدی جلدی کام نمٹا کر آنے والا منا...... جس کے چہرے پر ہمیشہ ہی بارہ بجتے رہتے اور جو کبھی ٹھیک سے سیدھے منہ بات تک نہیں کرتا تھا وہی منا اب بدلا بدلا سا تھا...... گھبرایا ہوا— پوچھنے پر بھی گھبرا جاتا یا حونقوں کی طرح چہرہ دیکھنے لگتا—

کبھی کبھی منا کے کچھ دوست بھی کھوجنے آتے۔ جن کے چہرے کرخت ہوتے اور جن کو برکت حسین نے کبھی اس سے پہلے منا کے دوستوں میں نہیں دیکھا تھا— جو بوڑھے میاں کو بڑے ادب سے نمستے تو کرتے، مگر پتہ نہیں برکت حسین کو منا کے یہ نئے دوست جچتے نہیں تھے—

یہ آتے تو منا اور بھی زیادہ گھبرایا ہوا لگتا تھا۔ برکت حسین کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ہوائیاں چھوٹنے لگی تھیں۔ پھر وہ اپنے کمرے میں جاتا اور کاغذ یا تھیلی کی شکل میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نکال کر ان کے ہاتھوں میں تھما دیتا۔

یہ خیال بھی ان کے دل میں آیا تھا— منا کسی غلط کاروبار میں تو نہیں لگ گیا؟

مگر برا کاروبار کیسا۔ سرکاری نوکر ہے۔ بجلی آفس میں کلرکی کرتا ہے— جائیداد نہ سہی اپنا مکان تو ہے دو دو دکانوں سے کرائے آتے ہیں۔ بھلا غلط کاروبار کیوں کرنے جائے گا۔ کئی دنوں سے وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اب اگر نشی روتی بھی رہتی تھی تو منا شمیم پر جھنجھلاتا نہیں تھا اور دنوں کی طرح نشی کے روتے ہی برس نہیں پڑتا تھا خود ہی آگے بڑھ کر گود میں اٹھا لیتا۔ کمرے میں ٹہلانے لگتا—

یہ سب......؟

منا کو کوئی بیماری تو نہیں ہوگئی ہے؟

برکت حسین گھبرا گئے— اس دن منا آیا تو وہ اپنی کمزوری چھپا نہیں سکے۔ بیٹا بیٹا کہتے ہوئے پیچھے چلے آئے۔ منا کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا۔

''تم بیمار ہو کیا؟''

''کتنی بار کہا ہے ابا۔ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ میں کوئی بیمار و یمار نہیں ہوں۔''

''نہیں ہو تو پھر مجھے کیوں لگ رہا ہے۔''

''میں کیا جانوں۔ مجھے تنگ مت کیجئے۔''

''دیکھ— کوئی پریشانی ہے آفس میں کوئی بات ہوئی ہے......؟ نوکری پر کوئی خطرہ ہے......؟''

''کوئی خطرہ وطرہ نہیں ہے ابا۔ بس مجھے تنہا چھوڑ دیجئے۔''

انہوں نے منا کی بات مان لی۔ تنہا چھوڑ دیا— مگر اپنے ذہن کو تنہا نہ کر سکے جو لگاتار منا کے چہرے میں کھویا ہوا تھا۔ دوپہر میں بہو نے کھانا لگایا تو انہوں نے دریافت کیا—

''منا ایسا کیوں ہو رہا ہے آج کل۔''

شمیم نے ابا کی بات سنی تو ہونٹ لرز گئے۔ زور سے بولی۔ ''میری تو قسمت پھوٹ گئی ابا۔ میں کیا جانوں، مگر...... بہت بدل گئے ہیں وہ......''

''کیا بدل گئے ہیں؟''

شمیم نے آنچل سے آنسو صاف کیے۔ کسی پریشانی میں رات بھر سوتے نہیں۔ اٹھ اٹھ کر ساری ساری رات ٹہلتے رہتے ہیں۔''

''اچھا—''

وہ ایک دم سے چونک گئے۔'' تم نے پہلے کبھی بتایا نہیں۔''

''میں کیا بتاتی ابا۔ میں سمجھتی تھی آپ کو معلوم ہوگا—''

''تم نے کچھ پوچھا نہیں۔ بات کیا ہے؟''

''پوچھا تھا۔ کئی بار پوچھا تھا۔ وہ ڈانٹ دیتے ہیں۔''

جمیلہ نے سنا تو جھنجلا کر بولی—

''آپ لوگ ناحق میرے بچے کے پیچھے پڑے ہیں۔ ارے زمانہ خراب، حالات اچھے نہیں۔ یہی سب سوچ کر پریشان رہتا ہے۔''

''لیکن پریشان تو ہم بھی رہتے ہیں۔ تم بھی ہو جمیلہ۔ لیکن منا کی پریشانی...... کچھ اور ہی دکھتی ہے—''

''ہاں اماں آپ دیکھتی نہیں— پہلے کیسے تھے وہ۔ بات بات پر جھنجلا جاتے تھے وہ...... اب— نشی کو اٹھا کر پیار بھی کرتے ہیں وہ...... کیسے سمجھاؤں میں......''

برکت حسین گہری سوچ میں ڈوب گئے— ماجرا کیا ہوسکتا ہے؟ کوئی خطرناک بات نہیں ہے۔ نہیں تو...... پھر منا میں آئی اس تبدیلی کی وجہ کیا ہے۔ اتنی تبدیلی بے بات اور اچانک تو نہیں آسکتی...... وہ ذرا سوچ میں ڈوب گئے۔ معاً انہیں ان کے دوستوں کا خیال آیا— منا کے یہ نئے دوست۔ وہ شمیم کی طرف مڑے۔

''منا کی دوستی آج کل کافی بڑھ گئی ہے......''

''ہے تو...... لیکن ابا وہ دوست بنانے والے آدمی نہیں ہیں۔' شمیم کہتے کہتے رک گئی۔ رات میں لوٹتے ہیں تو ہاتھ میں کچھ کاغذات بھی ہوتے ہیں۔''

''کیسے کاغذ—؟''

''پتہ نہیں۔ دفتر کے ہوتے ہوں گے۔ لیکن مجھے ایک بار غصے سے بولے تھے۔ میرے کاغذوں کی ہیر پھیر مت کرنا۔ چھونا بھی مت—''

''کہاں رکھتا ہے؟''

''کمرے میں پلنگ کے نیچے اور کہاں......''

وہ جیسے دوبارہ سوچ میں ڈوب گئے۔ دفتر کی اتنے دنوں کی نوکری میں پہلے تو وہ کوئی پینڈنگ کام گھر نہیں لایا۔ اب—؟ لوٹنے میں بھی دیری ہوجاتی ہے دفتر میں کتنا کام بڑھ گیا ہے۔ ٹھیک سے بولتا بھی نہیں—

''دیکھو بہو—'' برکت حسین آہستہ سے بولے......'' مجھے لگتا ہے...... ان دنوں وہ بہت پریشان رہنے لگا ہے...... تم اس کی بیوی ہو۔ کوشش کرو کہ اس کی پریشانی کی وجہ معلوم ہوسکے۔ ہاں کوشش کرو—''

وہ اپنے کمرے میں آگئے۔ کمرہ جیسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا— یہ بڑھاپا بھی عجیب چیز ہے...... ذرا سا سوچو، فکر کرو تو تھکن وجود پر مسلط ہوجاتی ہے۔ سارا بدن تھکا تھکا سا لگتا ہے...... وہ تھک گئے ہیں...... ہاں بہت تھک گئے ہیں...... تازہ واقعات کی یورش نے اس قدر تھکا دیا ہے کہ مزید جینے کی خواہش سو گئی ہے۔ صرف ڈر لگا رہتا ہے...... ڈر جو موت کی چغلی کھاتا ہے...... ڈر...... جو خوف کی زبانیں نکال نکال کر دکھاتا ہے...... کہ دیکھو میاں...... حالیہ واقعات نے تقسیم ہند کے دنگوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے— کوئی جگہ سلامت نہیں رہی...... ریلیاں دنگے اور مستقل ہونے والے فساد...... پتہ نہیں سرکار آئین اور قانون توڑنے والی پارٹیوں پر بندش کیوں نہیں لگاتی— ہر لمحہ دل کی دھڑکن تیز رہتی ہے...... باہر کے شور سن کر دل دھڑکتا ہے کہ کہیں کچھ ہو نہ گیا ہو— دو بجے کے قریب لاٹھی ٹیکتے ہوئے بالمکند شرما آئے۔

جوش صاحب کی داڑھی دودنوں کی بڑھی لگ رہی تھی...... جوش صاحب ماشاءاللہ قاعدہ قانون اور اصولوں کے اتنے پابند آدمی تھے کہ کبھی انہوں نے اس حال میں جوش صاحب کونہیں دیکھا تھا۔ نفاست پسند۔ مجال کہ روزانہ روٹین میں ایک دن کی بھی تاخیر ہوجائے۔ ایک دن بھی شیو کرنا بھی جائیں۔

''خدانخواستہ دشمنوں کی طبیعت تو درست ہے۔''

ایک تھکی بوجھل سانس لی جوش صاحب نے۔''ہاں میاں برکت حسین!— اب کیا بتاؤں...... بھول رہا ہوں...... بھولنے کی بیماری ہورہی ہے...... اچانک پل بھر میں بیٹھے بیٹھے لگتا ہے سب کچھ، سب کچھ بھول گیا ہوں— آج دوستوں نے مشاعرہ کے لیے بلایا تھا۔ دیکھونا، مشاعرہ جیسی چیز کو بھی بھول گیا۔ اچانک یاد آیا تو سوچا تم کو بھی ساتھ لے لوں—''

'لیکن یہ بیماری؟'

جوش صاحب نے ہنسنے کی کوشش کی۔''اب کیا بتاؤں...... یہ کوئی بیماری نہیں ہے میاں۔ بس......ایک دن بھول جاؤں گا کہ سانس بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور سانس نکل جائے گی......''

''کیا کہتے ہیں جوش میاں۔ مریں آپ کے دشمن۔ چلیے۔ مشاعرہ میں چلتے ہیں......''

مشاعرہ کرامت اللہ صاحب کے یہاں تھا۔ جو کسی زمانے میں شہر کے چیئرمین بھی رہ چکے تھے۔ باہر کا دالان خانہ مشاعروں اور اس طرح کی محفلوں کے لیے وقف تھا جوش صاحب جب پہنچے اس وقت تک شہر کی معزز ہستیاں پہنچ چکی تھیں۔ پانچ پاپیوں کا قافلہ بھی موجود تھا۔ فیض سقراطی، حبیب تنویر، باقر مرزا، احمد ربانی اور نازاں خیال نے ادب سے انہیں سلام کیا— جواب دیتے ہوئے وہ ایک جگہ بیٹھ گئے— کارروائی شروع ہوئی۔ غزلیں پڑھی جانے لگیں۔ درمیان میں شعروشاعری سے الگ باتوں کا رخ حالات کی طرف بھی مڑ جاتا—

حبیب تنویر نے اعتراض بھی کیا۔''اماں کرامت صاحب اب چھوڑیے بھی حالات کا رونا۔ دن بھر تو ہم سب حالات کے پنجڑے میں رہتے ہی ہیں— تھوڑی دیر شعروشاعری بھی ہوجائے۔''

فیض سقراط مسکراتے ہوئے بولا۔''ارے گھنٹے دو گھنٹے تو ہمیں یہاں رہنا ہے۔ شوق صاحب اب کیا مسجد اور کیا مندر—''

نعمان شوق صاحب نے حامی بھری۔ ویسے بھی وہ ادب برائے ادب کے قائل تھے اور ان فضولیات سے ادب کو پاک رکھتے تھے۔

'میں بھی یہی کہتا ہوں'، نعمان شوق بولے—''یہ مسئلہ شعروشاعری سے اور ہماری آپس کی بات چیت سے حل نہیں ہوگا۔''

کسی نے کہا۔''زمانہ خراب ہے، مسلمانوں کے سر پر تلوار لٹک رہی ہے۔''

میزبان کرامت اللہ صاحب گمبھیر لہجہ میں بولے—''ہاں بھائی سچ کہتے ہو، اب بس ڈر ڈر کر زندگی گزر رہی ہے۔' وہ بالمکند شرما جوش صاحب کی طرف مڑے۔''ارے ہم تو یہی کہتے ہیں، مسجد کا کیا ہے۔ مسجد تو ویسے بھی اب رہی نہیں۔ مندر تو اب بن ہی جانی چاہئے۔ کیوں بھائی؟''

''بے شک''، فیض سقراطی وغیرہم نے ان کی تائید کی۔''دیکھا سب یہی سوچ رہے ہیں جوش صاحب...... یہ میری، کرامت صاحب کی یا کسی ایک مسلمان کی بات نہیں ہے۔ سچائی یہی ہے کہ اب ہم میں سے کوئی بھی فساد نہیں چاہتا۔ سب تھک گئے ہیں اور یہ جان گئے ہیں کہ فساد میں مارا ہم کو ہی جانا ہے۔ فساد کرانے والے تو فساد بھڑکا کر گم ہوجاتے ہیں۔ اور معصوم ہندو اور مسلمانوں کی بن آتی ہے۔''

''فساد—'' حبیب تنویر نے اپنی آواز تیز کی۔ دیکھئے ناصاحبو۔ زمانہ کتنا بدل گیا۔ اب ذرا ممبئی کے فساد کو لیجئے۔ کیا سننے میں آیا۔ سننے میں آیا کہ سارا فساد بلڈرز کا کارنامہ تھا— جھگیاں بغیر فساد کے خالی ہونے سے رہیں— اور بلڈرز چاہتے تھے کہ جھگیاں ہٹا کر بلڈنگس کھڑی کی جائیں اور اس کے لیے چاہئے تھا ایک بڑا فساد۔ اب دیکھیے نا اس میں ہندو اور مسلمان کہاں ہیں۔ سیاست داں کہاں ہیں۔ یہ تو بلڈرز کا فساد ہے—''

حبیب تنویر نے بات آگے بڑھائی۔ فساد دنگے تو بس کھیل بن چکے ہیں کرامت صاحب۔ اب سٹہ کو ہی لیجئے۔ ملک میں چاروں طرف

سٹہ کا بازار گرم ہے۔ خاص کر ممبئی فساد کے بارے میں خبر ملی کہ اس کے بارے میں جے پور میں زبردست سٹہ لگا ہوگا یا نہیں، لاکھوں، کروڑوں کا جوا شروع ہوگیا—اور بلی کون چڑھا۔ عام انسان۔''

نعمان شوق نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''انسانیت مر رہی ہے۔ قتل ہو رہی ہے صاحب۔ کاروبار ہو رہا ہے انسانی جسموں کا— سب سے ارزاں ہوگیا ہے انسان کا بدن— چاہو تو سٹے میں لگادو...... چاہو تو بلڈرز کے مفاد کا نشانہ بنادو۔ انسان کو مرنا ہے...... وہ چاہے جیسے مرے۔ ان سے بھی بچ نکلا تو قدرتی آفات ہیں۔ سیلاب ہے...... طوفان ہے...... زلزلہ ہے...... اور......''

ایک بزرگ نے دھیرے سے کہا۔ ''کچھ بھی کیجئے۔ باقی تو کبھی کبھی کی چیزیں ہیں۔ مگر فساد کا موسم اب اس ملک کا چوتھا موسم بن گیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ بارہوں ماس اکیلا چلنے والا موسم فساد کا موسم ہے—''

''سچ کہا، بالکل سچ کہا—''

چودھری برکت حسین کو بزرگ کی بات سولہ آنے سچ لگی۔ وہ مسکرائے۔ پھر جوش صاحب نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ بھی مسکرائے۔

''لیکن یہ بھی سچ ہے۔'' کرامت صاحب پھر گمبھیر ہوئے۔ ''لیکن مسلمانوں کی زندگی ہے خطرے میں، اب اسی شہر کو لیجئے۔ آزادی سے پہلے بھی کبھی اس جگہ فساد نہیں ہوا۔ اور اب— ہر روز خدشہ لگا رہتا ہے...... کہ پتہ نہیں کب کیا ہوجائے کب دنگا بھڑک اٹھے۔''

فیض سقراطی بولا۔ 'اس وقت ملک کے حاشیہ پر سب سے بڑا ہیرو مذہب ہے۔'

حبیب تنویر نے لقمہ دیا۔ ''ہیرو نہیں، ولن کہو۔''

ایک بزرگ بگڑ گئے— ''چند لوگ اگر غلطیاں کرتے ہیں تو مذہب کو قصوروار کیوں مانتے ہیں آپ لوگ؟''

حبیب تنویر نے کچھ بولنا چاہا فیض سقراطی نے ہاتھ پکڑ لیا۔ ہر کا عقیدہ اس کے ساتھ ہے، ہمیں کسی کے عقیدے سے نہیں کھیلنا چاہئے۔

بزرگ تھوڑے اور ناراض ہوگئے— ''سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ بچے مذہب کو کھیل کیوں سمجھتے ہیں—''

حبیب تنویر کا لہجہ لڑکھڑا گیا— ''کھیل نہیں سمجھتے ہیں بزرگوار— لیکن یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا، وہ مذہب کے نام سے ہو رہا ہے۔ جن کے نام پر لڑنے اور کٹنے کا سلسلہ چل رہا ہے، وہ دھرم استھل ہیں— رام اور خدا آپس میں لڑنے یا دیکھنے نہیں آرہے ہیں۔ آرہے ہیں ہم اور آپ جیسے لوگ...... یہ مذہب کو آپ لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند کیوں نہیں رکھتے نمائش کے لیے باہر کیوں نکال لیتے ہیں۔''

بزرگ ہکلا کر بولنے لگے تھے...... ''نما...... ئش...... کیا...... کہا......''

کرامت صاحب نے نوجوانوں کو شانت کیا...... ''بہت ہوگیا میاں۔ اب خاموش ہوجاؤ— اس بحث سے فائدہ بھی کیا ہے......؟''

''ہاں کیا فائدہ ہے؟''

چودھری برکت حسین نے سر ہلا کر حامی بھری۔

بزرگ، برکت حسین پر چڑھ دوڑے...... ''میاں برکت حسین آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔ گھر جلے گا تو بے چارے مسلمانوں کا— ہم لوگوں کا—'' برکت حسین چونک گئے۔

جوش صاحب حیرت سے بزرگوار کا چہرہ پڑھنے لگے۔

''کیا فرما رہے ہیں مولانا؟''

برکت حسین کی آواز لڑکھڑا گئی۔ ''یہ آپ کس زبان میں بات کر رہے ہیں۔''

''واہ جناب اب زبان بھی، اپنی زبان بھی بھول گئے۔'' بڑے میاں نے سر نچایا— جیسے آپ کچھ جانتے ہی نہیں۔ بھولے بن رہے ہیں۔ ارے آپ کو کیا فرق پڑے گا۔ آپ کا لڑکا بھی تو...... بھاجپا کا آدمی ہے......

''کیا—؟''

برکت حسین ایسے اچھلے، جیسے دشمن نے اچھل کر، ان پر تلوار سے وار کیا ہو۔
تلوار کی تیز دھار بدن کے کسی نازک حصے کو چھوتی ہوئی نکل گئی ہو...... بڑے میاں نے جوش صاحب کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر غصہ جم گیا تھا۔ بڑے میاں کو طیش آ گیا۔

''اب ان ہی جوش صاحب کو دیکھئے، یہاں مشاعرے میں آتے ہیں، نعت پڑھتے ہیں اور وہاں ان کا لڑکا سبھائیں بلواتا ہے۔ مسلمانوں کے خلاف بولتا پھرتا ہے ــــ ہے ہے...... کیا نازک زمانہ ہے۔ تلوار بھی چلاؤ۔ اور مرہم پٹی بھی کرو۔ ارے میں کہتا ہوں سب بیکار ــــ شعروشاعری میل ملاپ کی باتیں، سب آخ تھو......''

دیگر لوگوں کے سمجھاتے بڑے میاں ہکلاتے ہکلاتے اٹھے اور غصے سے اپھنتے ہوئے دروازہ سے باہر نکل گئے۔

جوش صاحب کو جیسے کاٹھ مار گیا۔ پتھر کی موت بن گئے۔ سر نیچا ہو گیا ــــ یہ کیا تھا ــــ اب اس طرح سر بازار انہیں تماشہ بننا پڑے گا۔ برکت حسین کو بھی کچھ یہی لگ رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے منا کا سہما سہما چہرہ گھوم رہا تھا...... تیز تلوار انہیں زخمی کرتے ہوئے نکل گئی تھی...... اور یہاں سانس کے چلنے کے باوجود ــــ کرامت اللہ کے دالان خانے میں ایک بے حس جسم تھا جو تلوار سے کٹنے پر ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا ــــ

(۲)

بالمکند شرما خاندان، تہذیب اور اخلاق کی اس کھونٹ سے بندھے تھے۔ جہاں سب سے بڑی چیز ہوتی ہے عزت ــــ عزت جس کے لیے جان لی بھی جاتی ہے اور گنوائی بھی ــــ کل تو سارا کھیل عزت کا تھا۔ بیاہ، شادی، زندگی کی ڈور سے بندھی ہر رسم، ہر رواج پر عزت کا قبضہ تھا۔ زندگی میں اور ہوتا کیا ہے، پاتا کیا ہے ایک مجبور انسان۔ بس عزت ہی نا؟ اور بچے اس عزت کا جنازہ نکال دیں تو......

ایسے ناشکرے بچوں کو یہ دل کیسے قبول کرلے ــــ؟

بڑھاپے کا 'گھر' تو اور بھی بے جان ہوتا ہے۔ دھڑکا، تپاک اور اس طرح کی بیماریاں ــــ مشاعرے میں جو بھی ہوا وہ ایک خراب کی بدترین تعبیر سے بھی زیادہ بھیانک تھا...... انہیں لگا، ان کی عزت کی پالکی رکھا گئی، سر بازار ــــ برکت حسین کو چھوڑ کر گھر چلے تو دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ دروازے میں داخل ہوئے تو مالو لپک کر آئی۔ مالو کو ان دیکھا کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ مالو دوبارہ لپکی تو جھٹک دیا۔ غصے میں سیڑھیاں چڑھ گئے۔ دوازہ بند کرلیا ــــ سانس پھول رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا...... گھر کی ہر چیز توڑ ڈالیں...... ہر چیز...... مگر اوپر چڑھتے چڑھتے سانس اتنی پھول گئی...... کہ کچھ بھی...... سمجھ میں نہیں آیا...... سب بھول گئے۔ آنکھوں کے آگے سرمئی اندھیرا اتر آیا...... زور زور سے چیخے...... گلدان اٹھا کر زمین پر دے مارا...... نریندر دوڑا دوڑا آیا۔ ویسے مالو سے ددو کی طبیعت خراب ہونے کی خبر مل گئی تھی......

دروازہ بند تھا ــــ

اندر جیسے توڑ پھوڑ مچ رہی تھی......

پتا جی دروازہ کھولیے ــــ

نریندر وحشت سے چیخا ــــ

پھر جیسے کانچ ٹوٹا ہو ــــ کوئی چیز زمین پر دھپ سے گری...... اور ٹوٹ کر چور چور ہو گئی......

دروازہ کھولیے......

پتا جی......

اب مالو رونے لگی تھی۔ اوما بھی دوڑی دوڑی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

نریندر گھبرایا ہوا تھا...... 'دیکھو نا؟ پتا جی نے خود کو اندر سے بند کرلیا ہے۔ وہ سخت غصہ میں لگ رہے ہیں۔ اندر کی چیزیں بھی توڑ رہے

ہیں......‘

’’پتا جی پاگل تو نہیں ہو گئے......‘‘

اوماشک کا اظہار کرتے ہوئے پھر ڈر محسوس کر رہی تھی......

’’پاگل؟‘‘

نریندر کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی......

’’پتا جی!‘‘

اور ایک تیز جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ سامنے وحشت سے نکلی ہوئی دو پتلیاں تھیں— دو انتہائی غصہ میں ڈوبی آنکھیں۔ کمرہ حشر کا میدان نظر آ رہا تھا۔ ریک کی ساری کتابیں زمین پر تھیں۔ شیشے کے گلاس، گلدان شہید پڑے تھے۔

’’پتا جی......‘‘

’’کون ہو تم۔ کیوں آئے ہو؟‘‘

بوڑھا اپنی پوری طاقت لگا کر گرجا۔

’’میں، نریندر ہوں۔‘‘

’’جھوٹ بولتے ہو۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم ایک بھاجپائی ہو۔‘‘

’’پتا جی......‘‘

نریندر کو اپنی آواز بے حد کمزور لگی......’’دیکھئے، آپ کو بلڈ پریشر بھی ہے پتا جی......اور آپ کی طبیعت —‘‘

اس نے آگے بڑھ کر ہاتھ تھامنا چاہا— بالمکند نے ہاتھ بے رخی سے جھٹک دیا— مالو آگے بڑھ کر ددو سے لپٹ گئی......

’’ددو۔‘‘

’’دور ہٹ —‘‘

بالمکند نے زور سے ڈانٹا۔’’کیوں آئے ہو مجھے پریشان کرنے...... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو...... چلے جاؤ......‘‘

’’نہیں۔ ہم آپ کو یوں نہیں چھوڑیں گے۔ آپ نیچے چلئے پتا جی......‘‘

وہ دھم سے بستر پر بیٹھ گئے۔ آنکھیں تن گئی تھیں۔ جسم لرز رہا تھا......انہوں نے کانپتا ہوا ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرا...... چہرہ جیسے پسینے میں نہا گیا تھا۔ وہ جیسے ہاتھ جوڑے نریندر کے سامنے لرز رہے تھے۔

’’ابھی مجھے تنہا چھوڑ دو۔ تنہا چھوڑ دو مجھے —‘‘

●●

جیسے ایک گرم صبح ہوتی ہے۔ جیسے آگ برساتا ہوا سورج کا گولہ ہوتا ہے......زمین تپتی ہے......جھلستی ہے......اور جیسے اس جھلستی تپتی گرم زمین پر بارش کی ایک بوند ٹپک جاتی ہے......جیسے ہلکی سی بارش ہوتی ہے......اور ماحول میں حبس پھیل جاتی ہے......

جیسے بوڑھے آدمی کا دماغ ہوتا ہے...... تپتا ہے، ایندھن کی طرح جھلستا ہے، ریت کی طرح، پھٹتا ہے لاوے کی طرح......اور پھر...... گرم تپتی ریت پر جیسے بارش کی ایک بوند —

میز ہے، کرسی ہے اور بالمکند شرما ہیں۔ ہاتھوں میں قلم ہے......صبح کا وقت ہے۔ دھوپ کی شعائیں، کھڑکیوں سے چھنتی ہوئی کمرے میں در آئی ہیں......اب بھی ذہن پر اتنی ہی ہلچل یا تپش ہے، جیسی گرم ریت ہو......

کاغذ ہے......اور قلم ہے......اور چلتا ہوا ہاتھ......

میرے سامنے صرف ایک اتیت ہے۔

ایک اتیت، جہاں جا سکتا ہوں میں، جہاں جانا مشکل نہیں کہ راستے میں آنسوؤں کی ایک ندی پڑتی ہے...... یادوں کا ایک گہرا دریا ہے...... جسے عبور کرنا آسان نہیں—

میرے سامنے صرف ایک اتیت ہے......

لیکن یہ اتیت مجھے میری جان سے پیارا ہے...... مجھے مری سب سے عزیز ترین شے سے بھی زیادہ عزیز ہے...... یہ اتیت برا بھی ہے......اس اتیت میں میرے کھٹے میٹھے قصے تو ہیں......میری شرارتیں تو ہیں......مگر اس کے علاوہ ایک بدنما غلامی بھی ہے......

میرے سامنے صرف ایک اتیت ہے......

اور جیسا دوسرے بھی جان گئے ہوں گے کہ اس اتیت میں غلامانہ دور کے زخم چھپے ہیں......میرا لہولہان بدن چھپا ہے...... کچھ کڑوی یادیں چھپی ہیں......اور کچھ نفرت کے زہر بھی گھلے ہیں......مگر جس اتیت میں فرق کے پیوند تھے اور نفرت کے دھبے، وہ اتیت تو میں اسی وقت وقت کے اگالدان میں پھینک آیا— مجھے اس اتیت سے بھلا کیا لینا تھا......

مجھے تو ایک سندر، سلونا اتیت چاہئے تھا...... وہ اتیت جسے میں جب چاہوں، جادوگر کے ڈبے کی طرح اپنی مٹھیوں میں اگا لوں...... میں جب چاہوں، تنہائی کے سروں میں پالوں، جب چاہوں آنکھیں بسا لوں، کلیجے سے لگا لوں۔

میرے سامنے صرف ایک اتیت ہے......اتیت جسے آنسوؤں سے لکھنا ہے اور......جیسے گرم تپتی ریت پر بارش کی ایک بوندھ...... وہ ابھی تک نہیں پہنچے...... بالمکند شرما گھڑی دیکھتے ہیں...... وہ پانچ پاپی ابھی تک نہیں پہنچے۔ آتے ہی ہونگے...... یہ زخم تو اب ٹیس دینے لگا ہے......

قلم کو کاغذ پر جمائے وہ گہری سوچ میں ہیں۔ قلم ٹھہرا ہوا ہے......

''میرے سامنے......''

اور سامنے کھڑے ہیں وہی پانچ پاپی—

''آپ نے یاد کیا ہے جوش صاحب؟''

فیض سقراطی، نازاں خیال، حبیب تنویر، باقر مرزا، احمد ربانی......

وہ سب کے چہرے کو باری باری سے تکتے ہیں......مسکرانے کی کوشش کرتے ہیں۔

''ہاں، بیٹھ جاؤ، میں نے ہی بلایا تھا۔ میاں غلطی تو نہیں کی؟ نہیں......اپنے بچوں جیسے ہو تم؟ بلایا تھا......بیٹھ جاؤ......''

آواز کبھی شکستہ ہوتی ہے، کبھی ٹوٹتی ہے......کبھی لرز جاتی ہے......

''تمہارے آنے سے قبل میں کچھ لکھ رہا تھا۔ دیکھو......میرے سامنے صرف میرا اتیت ہے......اور......ایسا کیوں ہے......تم میں سے کوئی بتا سکتا ہے......نہیں...... مجھے اس طرح دیکھ کر پریشان ہو گئے ہو بچو! ایسے پہلے کبھی نہیں دیکھا نا......لیکن بچوں......سنو......غور سے سنو۔ جو میں کہہ رہا ہوں...... میں اتیت میں چلا گیا ہوں......اتیت میں کون جاتا ہے......جس کا انت آ گیا ہوتا ہے بچو......سب سے زیادہ اتیت سے پیار اسی کو ہوتا ہے...... میں تھک گیا ہوں۔ اتنا تھک گیا ہوں کہ اب ایک لمبی نیند سونا چاہتا ہوں......آں، پریشان مت ہو— سنو۔ جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ آج تم نہیں بولو گے......صرف میں بولوں گا......وعدہ؟ ٹھیک ہے......تو سنو...... میں بھلکڑ ہو گیا ہوں...... یہ صحیح بھی ہے...... جو سامنے ہے، اس میں یاد رکھنے کو ہے ہی کیا میاں۔ کہتے ہیں کہ موت نزدیک ہوتی ہے تو اسے اس کے گزرے ہوئے عزیز، رشتہ دار آواز لگاتے ہیں......وہ اپنے اتیت میں لوٹتا ہے اور ان کی صدائیں سنتا ہے......اور وہاں جہاں جنت و دوزخ جیسی کوئی اگر شے ہے، تو وہاں اس کے عزیز اس کا انتظار شروع کر دیتے ہیں۔

بچو......ممکن ہے۔ میں بہک رہا ہوں......تو آج......ابھی اس لمحے، جب تم میرے پاس ہو، میرے بہکنے کو بھی معاف کرنا......اور اب سنو......میں جو کہنے جا رہا ہوں......غور سے سنو......میں جا رہا ہوں یا جانے والا ہوں، تمہارے درمیان سے ہمیشہ کے لیے—

لیکن اس میں حیرانی کی کیا بات ہے بچو۔ جو آتا ہے وہ جاتا ہی ہے اور میں نے کافی وقت تمہاری اس بے رحم دنیا میں گزار لیا ہے......اس کے باوجود مجھے لگتا ہے تمہارے ساتھ......ایک حادثہ......ایک بڑا حادثہ ہونے والا ہے......اور سنو...... پتہ نہیں کیوں......آخر وقت میں کوئی آدمی......جو مجھ میں برسوں سے رہا ہے......مجھ سے چیخ کر کہتا ہے......کہ میاں، یہ تمہارا جانا ہی سب سے بڑا حادثہ ہے —

سنو، میں جا رہا ہوں...... میں پھر نہیں آؤں گا...... میں تمہارے درمیان پھر کبھی واپس نہیں آؤں گا...... میں تمہارے درمیان کی ایک کڑی تھا۔ میں مشق سخن کرتا تھا— میں تمہارے درمیان ہنستا بولتا تھا۔ اب دوسرے آئیں گے، لیکن — میں نہیں آؤں گا اور جان لو...... میری طرح کا کوئی آدمی تمہارے درمیان، اس طرح ہنستا بولتا نہیں آئے گا—

میرے بچو......

میرے سامنے صرف ایک اتیت ہے......

اور جیسے کوئی غیبی صدا کچھ کہلواتی ہے......شاید ویسے ہی مجھے بھی الہام ہوا، یہ — یہ صدا دی گئی کہ میں تم پانچوں کو بلاؤں...... یہاں...... اور کہوں......سنو......میں اتیت میں جا رہا ہوں......

میں اب تمہارے درمیان کبھی واپس نہیں آؤں گا......

کبھی واپس نہیں آؤں گا......

اور اتیت کی باقی کہانی لکھنے کا فرض تمہیں ادا کرنا ہوگا......

تم لکھو گے نا؟ بولو......جواب دو......

پھر وہ بستر پر لیٹ گئے، اور ایسے لیٹ گئے، جیسے نیند آ گئی ہو —

''جوش صاحب!''

ان پانچوں نے گھبرا کر آواز لگائی—

وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے — ''گھبراؤ مت — ابھی مروں گا نہیں......ابھی ایک ضروری بیان دینا ہے مجھے......'

ان کے چہرے پر بچوں کی طرح کھلکھلاہٹ تھی۔ پانچوں ان کی حرکتوں کو دم بخود دیکھ رہے تھے۔ اس طرح کہ جیسے کسی پاگل کو دیکھ رہے ہوں—

اتیت

ایک پاگل اتیت ہے
ایک ہم ہیں
اور ایک ہے پانی سے بھری ٹھنڈی صراحی
ایک کھلا کھلا باغیچہ ہے
ہریالی ہے
اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہیں
کچھ بچے ہیں، میرے بچوں جیسے، میرے بچوں کے چہروں جیسے
ہاتھوں میں جامن ہے، گُن منی بیر ہیں
اور شرارتیں ہیں
شرارتیں جن کے دائرے نہیں ہوتے
اور جن کی تہذیب نہیں ہوتی

ایک ہم ہیں
اور ایک پاگل اتیت ہے

بالمکند شرما جوش

اتیت سے کچھ یادیں

(۱)

بالمکند شرما جوش کے پتا یعنی رام ولاس شرما تک آتے آتے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام کو کسی حد تک تو خاتمہ ہو ہی چکا تھا۔ لیکن یہ رگوں میں دوڑنے والا خون تھا کہ اعلیٰ نوابیت کے آثار پوری طرح موجود تھے۔ کسی پر نثار ہو جانا تو خود کو لٹا دینا، اعلیٰ ظرفی کی ایک سے ایک مثالیں اس گھر کے نام سے دی جاتی تھیں۔ کبھی طوطی بولتا تھا، اور کہتے ہیں اردو فارسی تو اس گھر کی لونڈی تھی۔ بولنے پر آتے تو جیسے شہد کی ندیاں بہہ رہی ہوں۔ زبان میں اتنی مٹھاس، رہن سہن میں اتنی نفاست سلیقہ مندی اس قدر کہ شاہی گھرانوں کے قصے بھی ایک طرف — یہ الگ بات ہے کہ بالمکند شرما جوش تک آتے آتے یہ شان، آن بان لوگوں کے پست مذاق کو زد میں آ گئی۔

بالمکند شرما جوش کے دادا تھے پرتاپ بہادر شرما۔ ان کے نام سے ایک دلچسپ واقعہ کچھ یوں منسوب ہے کہ ایک بار پرتاپ بہادر ایک نواب صاحب کے یہاں مہمان ہوئے۔ ہفتوں وہیں رہے۔ دعوت اڑائی، شطرنج کی بازیاں جمتی رہیں۔ پھر ایک دن موڈ میں آئے بولے، اچھا نواب صاحب اب اجازت دیجئے۔ تانگہ منگوائیے۔ نواب صاحب نے تانگہ منگوایا۔ پرتاپ بہادر نے کوچوان کو دیکھا۔ منہ سکوڑا۔ انہیں گھوڑا تو پسند آیا مگر کوچوان نہیں۔ بولے۔ ''رہنے دیجئے نواب صاحب، پھر کسی دوسرے دن......''

دوسرے دن اگر کوچوان پسند آیا تو گھوڑا دبلا پتلا نکل گیا — جانے کی باری پھر ٹل گئی۔

پھر ہفتوں گزر گئے۔ کبھی گھوڑا پسند آتا تو کبھی کوچوان۔ کبھی دونوں پسند آتا تو کوچوان کا نام جی کو بھاتا نہیں۔ نواب صاحب بھی پریشان ہو گئے۔ پھر آخر ایک دن نواب صاحب نے ایک خاص تانگے والے کو بلایا — کوچوان کا نام گلاب تھا۔ گھوڑا عمدہ نسل کا تھا۔ گلاب خود بھی خوبصورت نوجوان تھا — بس پرتاپ بہادر بیٹھ گئے — کہ اب اجازت دیجئے نواب صاحب......آہا......ہہ......ہہ......گھوڑا اتنا خوبصورت۔ کوچوان اتنا اچھا......اور کوچوان کا نام اتنا پیارا۔ بس اب اجازت دیجئے — بار بار پیار سے، ہاتھوں سے کوچوان کا گال سہلاتے......واہ بھائی واہ مزہ آ گیا۔ بس چلو میاں — یکے میں بیٹھ گئے۔ یکہ چل پڑا۔ نواب صاحب کی جان میں جان آئی۔ مگر اصل واقعہ یوں ہے کہ بیچارہ برا پھنسا تو کوچوان — جو ہفتہ بھر پرتاپ بابو کو لے کر ادھر ادھر گھومتا رہا اور عاجزی سے پوچھتا رہا۔ سرکار گھر کا پتہ تو بتائیے۔ چلنا کہاں ہے؟ اور پرتاب بابو مسکراتے ہوئے یہی کہتے رہے......میاں تمہارا نام اتنا اچھا، تم اتنے اچھے، تمہارا گھوڑا اتنا اچھا......اب جاؤں تو کہاں جاؤں۔ اور واقعہ ہے کہ بیچارہ کوچوان ہفتہ گزار کر ہانپتا کانپتا نواب صاحب کے یہاں یکہ لے کر حاضر ہوا۔ ہاتھ جوڑا کہ حضور، بس آپ ہی کچھ کیجئے۔ یہ تو چھوڑتے ہی نہیں —

ایک دوسرا واقعہ یوں منسوب ہے کہ لحاظاً مروتاً نواب صاحب اور پرتاپ بابو میں ایک بار سلام کرنے کی ہوڑ لگ گئی — ایک سلام کر کے رکتا تو دوسرا سلام کے لیے ہاتھ اٹھا دیتا — دوسرے کا ہاتھ جھکتا تو پہلا لحاظا کہ شرمندگی نہ ہو، آداب میں ہاتھ اٹھالیتا — گھنٹوں گزر گئے — دیکھنے والوں کی بھیڑ لگ گئی۔ بڑی مشکل سے انہیں دیوانِ خاص میں بلوایا گیا۔ تب جا کر ان کا سلام کرنا بند ہوا اور دونوں شطرنج نکال کر بیٹھ گئے۔

رام ولاس شرما جی کے بارے میں مشہور تھا کہ فارسی کے استاد تھے۔ شہر میں کوئی سا بھی اجلاس ہو، مشاعرہ ہو، محفل ہو، خصوصی طور پر بلوائے جاتے — صدارت کی کرسی انہیں ہی سونپی جاتی — جب تک زندہ رہے شہر کی شان بنے رہے۔ مرے تو لوگ کہتے تھے کہ ایسے لوگ پیدا کہاں ہوتے ہیں — لیکن بالمکند شرما جوش تک آتے آتے تہذیب اور پرانی قدروں کی تعریف کچھ حد تک بدل چکی تھی — پھر آزادی کے بعد ہر صبح یہ تعریف بدلتی رہی — انہیں تو اپنے گھر میں ہونے والے وہ مشاعرے یاد تھے جہاں ہندستان بھر سے اعلیٰ پائے کے شاعر بلائے جاتے اور کئی کئی

روز تک گھر میں جشن کا سماں رہتا تھا— لیکن بدلتے وقت نے پرانی قدروں کو کسی حد تک زخمی ضرور کیا تھا۔ جیسے وہ دیکھ رہے تھے کہ وقت کی گردش کا انداز بدلا تھا۔ سورج کا نکلنا، ڈوبنا، صبح شام رات کا ہونا، موسم کا بدلنا، سب میں ایک نمایاں فرق آیا تھا۔

وقت گزاری کے لیے وہ وکالت کرتے تھے لیکن ان کی وکالت کبھی چلتی ہوئی نہیں دیکھی گئی۔ بھلا ایسے شاہی مزاج آدمی کو، جس نے خود کو اصول، قاعدے قانون اور تہذیب کی دقیانوسی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہو، بھلا موکل ملتا بھی تو کیسے— کبھی کبھی کوئی سر پھرا، انہیں کے جیسا موکل پھنس جاتا تو پھنس جاتا— ورنہ اللہ اللہ خیر صلی— ابھی بھی کافی جائیداد تھی۔ کورٹ بس وقت گزارنے کے لیے استعمال کرتے۔ جی نہیں چاہتا تھا تو وہ بھی نہیں— کورٹ بھی بس گپ شپ کے لیے استعمال کرتے۔ شاعری ہو رہی ہے اور پرانے ملنے والوں سے ملا جا رہا ہے۔ پرانے وقتوں کی یاد تازہ کی جا رہی ہے۔

انیل ان کی پہلی سنتان تھی۔ انیل تھوڑا بڑا ہوا تو خیال آیا۔ کسی اچھے مولوی صاحب کو بلا کر آموختہ شروع کرایا جائے کہ آخر وہ بھی تو آموختہ کے بعد ہی اصل پڑھائی کی طرف لوٹے تھے۔ لیکن بدلتی ہوئی ہوا کا پہلا احساس اس دن ہوا جب پتنی اور سسرالی لوگ مخالفت پر اتر آئے۔

''یہ کیا، بچے کو اردو پڑھواؤ گے؟'' ''کیوں؟''

مخالفت کی آنکھیں تو اس کیوں کا جواب ان کی آنکھوں میں گھور رہی تھیں......

''کیوں برائی کیا ہے؟''

''یہ مسلمانوں کی زبان ہمارے بچے کو نہیں پڑھائی جائے گی۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟''

وہ ایکدم سے چونک گئے...... آواز اندر ہی اٹک کر دم توڑ گئی...... پتا جی نے انہیں پڑھایا تو کیا ان کا دھرم پریورتن ہو گیا...... یہ سوچ...... یہ نئی ہوا...... وہ بس چہرہ دیکھ رہے تھے...... زبان جیسے پتھرا گئی......

پتنی انیل کا ہاتھ پکڑے کھڑی تھی......

وہ بہت کمزور لہجے میں بولے— زبان پر کسی کا حق تھوڑا ہے۔

''ہے کیسے نہیں؟'' پتنی کا چہرہ سنجیدہ تھا— اردو میں پڑھا کر مولوی بنانا ہے کیا— بچے کو بھوکے مارنا ہے۔ وقت بدل گیا ہے اب کوئی اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھاتا— ہم بھی نہیں پڑھائیں گے۔

بس سیدھا سادا فیصلہ— حکم صادر ہو گیا۔ لیکن وہ خود جیسے اجنبی خیالوں والی پگڈنڈی پر سوار ہو گئے...... وہ نرمی...... وہ شائستگی، وہ حسن، وہ نزاکت، ارے جو چاشنی اردو میں ہے...... وہ...... لیکن کس سے کہتے...... پتنی تو کب کی جا چکی تھی۔ انہیں لگا، اب دوسروں کو نہیں خود کو سمجھانے کی ضرورت ہے کہ میاں بالمکند شرما جوش، اب ہوش میں آجاؤ...... ورنہ جان لو اردو کو مسلمانوں سے جوڑنے والے کسی دن تم کو بھی مولوی بنا کر خاندان سے علیحدہ کر سکتے ہیں...... تم پر الزاموں کی بارش کر سکتے ہیں......

ہاں تم پر......

اور تم چاہ کر بھی اپنی کوئی صفائی نہیں دے پاؤ گے۔

ان کی زبان بند نہیں کر پاؤ گے۔

وقت گزرتا جا رہا تھا اور گزرتے وقت کے ساتھ ان کے نام کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے— ایک نام بالمکند شرما گھر کے لیے رہ گیا تھا۔ دوسرا جوش والا حصہ ان کے لیے محفوظ تھا، جینے کے نام پر کچھ تسلی بچا کر رکھنے کے لیے— یہ جوش بھی چھن جاتا تو بھلا جینے کے لیے رہ ہی کیا جاتا۔

وقت کی سرپھری ہواؤں میں کتنی ہی بار ان پر اعتراض بھی ہوئے— پھر نریندر آ گیا۔ بچے کیا کرتے ہیں۔ کیسے پڑھتے ہیں۔ انہیں اس سے زیادہ مطلب نہیں تھا۔ بچوں سے دل ٹوٹ گیا تھا— مشاعروں میں جانا، گھر پر مجمع لگانا، لونڈے لپاڑوں کی شاعری سننا، پتنی اور رشتے داروں کو کھلنے لگا تھا—

ایک دن پتنی نے تو کہا— ''بوڑھاپے میں لوگ مندر جاتے ہیں۔ ماتھ ٹیکتے ہیں......اور یہ آپ دن بھر کہاں غائب رہتے ہیں؟''

''شعر کہتا ہوں اور جیتا ہوں۔''

''سیدھے سادے ہیں آپ۔ یہی تو چاہتے ہیں وہ لوگ— کسی دن آپ کو مسلمان بنا کر چھوڑیں گے—''

●●

پتنی کا ممکن ہے یہ ایک چھوٹا سا مذاق ہو، مگر— اس بار دل دھک سے نہیں کیا— اب دھیرے دھیرے سہنے کی عادت پڑنے لگی تھی— ہاں کچھ خواب ٹوٹے تھے— ان خوابوں کی دھمک دل میں اب بھی سنائی دیتی تھی— بچے چھوٹے تھے تو خواہش ہوتی تھی، انہیں سینے سے لپٹا کر میرو غالب کی غزلیں سناتے...... جیسے ابا ان کے ساتھ کرتے تھے......کبھی تحت اللفظ......کبھی لہک کر...... مسکرا کر...... معنی پوچھ رہے ہیں......نہیں بتانے پر خود ہی معنی بتا رہے ہیں......لیکن کبھی بھول سے غلطی ہو بھی جاتی تو پتنی راستے میں آجاتیں—

''بچوں کو کیوں بگاڑ رہے ہیں آپ؟ سنانا ہے تو شلوک سنایئے۔ گیتا سنایئے، ہنومان چالیسا سنایئے......''

یہ عورت......اسی لیے یہ عورت جوان کی پتنی تھی، کبھی اس عورت سے وہ دل کا ٹانکا نہیں جوڑ سکے۔ سات پھیرے لیے تھے......بس یہ پھیرے تھے کہ وہ ساتھ نبھائے جارہے تھے......مگر اندر سے......زندگی کے اس ناٹک میں وہ ہر طرح کی اداکاری کرنے پر مجبور تھے—

سہنے کی طاقت اتنی تھی کہ بڑی سے بڑی بات ہوجانے پر خود پر جلد قابو رکھ لیتے۔ بات بدلنے کے فن میں ماہر تھے— ہنس کر پتنی کو بہلانے کی بھی کوشش ہوتی۔ مسکرا کر کہتے ......بیگم......تم تو ناحق اردو فارسی سے نالاں رہتی ہو......اب ایک دلچسپ لطیفہ سنو......دیکھو تو سہی ایک شخص نے کیسے فارسی کی ٹانگ توڑی ہے......ارے ہوا یوں بیگم کہ ایک شخص کو ترجمہ کے لیے کہا گیا...... جملہ یہ تھا کہ ''بڈّے نے اتنا کاٹا کہ پھول گیا، اب ذرا ترجمہ سنو بیگم اور حاضر جوابی کی داد دو......استخوان نرچوں تراشیدہ کہ گل رفت...... ہے نا مزیدار......مگر تم کیا سمجھو فارسی ......تم کیا جانو لفظوں کا حسن—''

خود ہی لطیفہ سناتے اور ہنس ہنس کر نہال ہوجاتے۔

پتنی جل بھن کر کہتی— ایک دن تمہاری ساری اردو کتابیں نہ بکوادیں تو میرا بھی نام بدل دینا۔

فوراً ہی اپنے پرانے رنگ میں لوٹ آتے۔ چہرہ بدل جاتا۔ آواز کانپ جاتی......''ایسا بھول کر بھی۔ بھول کر بھی مت کرنا۔''

پریشان، نڈھال سی آواز بھری...... یہ میری زندگی ہیں......زندگی بھر کا سرمایہ— بھول کر بھی......''

آواز تھرا جاتی۔ ٹوٹ جاتی— ہاتھ پیروں کے ریشے کانپ جاتے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے کمرے میں آجاتے۔

پانچ پاپیوں
کی
ایک جھلک یہ بھی

زندگی جیسی بھی ہو، وہ اسے خوبصورت کہتے تھے وہ اسے لے کر گھنٹوں سوچتے تھے۔ وہ اسے لے کر طرح طرح کے پلان بناتے تھے— جو ظاہر ہے ہوائی محل سے زیادہ نہیں ہوتے تھے— اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک، ایک دوسرے کی زندگی سے بھلی خوبی واقف تھا— زندگی ہی نہیں۔ گھر گھرانے سے بھی۔ یہ بھی کہ کس کے گھر میں کیا پکا— اور زندگی کیسے ایک جگہ ٹھہر کر، گرمی کی السائی دوپہریا کی طرح خود سے بے ربط مکالمے کرتی ہے— مکالمے...... کبھی ان مکالموں میں وہ اپنے وقت کے سب سے زیادہ ذہین اور پہنچے ہوئے دانشور بن جاتے— اور کبھی سڑک چھاپ— ان کے مکالموں میں فلموں کی ایکسٹرا گرل سے لے کر اڑوس پڑوس کی حسیناؤں تک کے نام تک درج تھے— ان میں سے سب کی اپنی الگ الگ محبوبائیں تھیں— جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کسی نے کسی کی محبوبہ کو دیکھا تک نہیں تھا— صرف چرچے تھے۔ گپیں ہوتی تھیں۔ اور گپیں بھی کیسی، ذہن میں بنتے، رچتے انہی حسین سپنوں کی، جو ہونٹوں تک آتے آتے پوری کی پوری ایک تصوراتی بن جاتے۔ اس طرح سب کی الگ الگ ہیروئنیں بھی بن گئی تھیں— یہ ہیروئینیں کبھی کبھی ان کی تخلیقات میں بھی جھانکا کرتیں۔

اور جب کبھی ان کا ذکر آتا تو ذکر کرنے والا اتنے دھیمے سے ہونٹ داب کر مسکراتا کہ جیسے پوچھ رہا ہو۔ میاں سمجھے کہ نہیں۔ اور باقی بیوقوفوں کی طرح اپنی گردن ہلانے لگتے تھے کہ بس بھئی بہت ہو گیا...... اب آگے بڑھو—

فیض سقراطی کے تصور والی لڑکی زہرہ تھی— تو احمد ربانی کی نادرہ— نازاں خیال ایم اے کی محبوبہ حنا تھی تو حبیب تنویر کی کوشلیا— اسے بھی وہ اپنی ترقی پسند کا ایک حصہ تصور کرتا تھا— اور باقر مرزا، 'نہاں' کے تصور کو لے کر پریشان رہتا تھا— اور نہاں اس پر کچھ اس طرح مسلط تھی کہ بازاروں، سڑکوں، غرض ہر جگہ وہ نہاں کو کھوجتا پھرتا تھا کہ پریوں کے دیس کی نہاں کو وہ اس طرح آمنے سامنے دیکھ پانے میں کامیاب بھی ہو گا یا نہیں— ان محبوباؤں کے نام پر آپس میں مذاق بھی ہوتے مگر سچائی میں یہ لڑکیاں تھیں کہاں؟— کہاں رہتی تھیں؟ ان کے ماں باپ کون تھے۔ سارے دن تو آواروں کی طرح یہ ایک دوسرے کے ساتھ چپکے ہوتے تھے۔ پھر یہ اپنی محبوباؤں سے ملتے ملاتے کب تھے— یہ کوئی نہیں پوچھتا تھا— ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے اس بارے میں جاننا بھی نہیں چاہتا تھا— اس لیے کہ اس جاننے اور نہیں جاننے سے بڑا بھی ایک سوال تھا، جو سوال اکثر مانس نوچنے والے گدھ کی طرح انہیں نوچتا رہتا تھا—

کہ خواب تک جانے والے راستوں کو پکڑنے کے لیے جو چیز ہوتی ہے۔ وہ کہاں سے لاؤ گے تم؟

کہاں سے حاصل کرو گے؟

شیخو میاں رنگ ریز کئی بار اپنے لڑکے فیض سقراطی کو اپنے پیشے میں آنے کی دھمکی دے چکے تھے— مگر برا ہو ادب کا— کہ وہ ابا کے رنگوں سے تر بتر، گندے ہو رہے کپڑے، اور رنگوں میں لپے پتے ہاتھ پاؤں کو دیکھتے ہوئے اس کیچڑے میں واپس نہیں آنا چاہتا تھا— ہاں جب کبھی ابا

سے ڈانٹ پڑ جاتی تو وہ باقی چاروں دوستوں کو پکڑ کر ملک کی بدنصیبی کو سوسو کوسنے دینے بیٹھ جاتا—

بی اے فیل احمد ربانی کبھی کبھی غصے میں کہتا— ہم سب تاریکی کی کوکھ سے جنمے ہیں اور ایک دن اسی تاریکی میں مل جائیں گے— وائنڈ— پھر سب کچھ ختم— نہ گھر والوں کو ہمارے لیے رونا پڑے گا، نہ باہر کے لوگوں کو ہمارے جنازے کا بوجھ ڈھونا ہوگا— سب کے لیے وہ دن، چین اور سکون کا دن ہوگا—

''فارگٹ اٹ— '' حبیب تنویر جیسے کسی گہرے خواب سے بیدار ہوتا۔ ایک گندی سی گالی اچھالتا— ''ہم سب نالی اور کیچڑ میں لوٹتے ہوئے سور ہیں بس باسٹرڈ، ہم عشق کے لائق بھی نہیں ہیں— نہ یہ کہ ہمیں چاہا جائے— نہ ہمیں یہ حق کہ ہم کسی کو چاہیں— ''

پھر جیسے سب اداسی میں ڈوب جاتے۔ سر نیچا کر لیتے۔ باقر مرزا کو لگتا جیسے اس کی نہاں...... دور...... بہت دور...... بادلوں کی اوٹ میں چھپتی جا رہی ہو......سب کے سب اپنی اپنی تصور والی لڑکی کے ساتھ اداسی کے شاہراہوں میں کھو جاتے— پھر چپی بڑھتی جاتی—

حبیب تنویر مسکرا کر، اپنی کرانتی والی کویتا کی پنکتی پڑھتا۔

''لکھی جائے گی......''

کل۔

کوئی کرانتی ہمارے ہی ہاتھوں سے

''یہ ہاتھ ابھی برفیل آندھیوں کی زد میں ہیں......''

''لیکن یہ ہاتھ اٹھیں گے......چلیں گے ایک دن......''

''تم اپنی بے سر پیر کی کویتا اپنے پاس رکھو— نازاں خیال برامان جاتا۔''

احمد ربانی کو جیسے ایک انوکھا خیال ہاتھ آ گیا۔

''سنو، مان لو، اگر ہم بیکار نہیں ہوتے تو؟''

''بیکار نہیں ہوتے تو......''

ترقی پسندی کی آنکھوں میں چمک لہرائی تھی—

''بیکار نہیں ہوتے تو کہیں کام کر رہے ہوتے ......کیوں؟'' احمد ربانی اپنے سوال پر منہ پھیر رہا ہوتا۔

''کام کر رہے ہوتے اور فرض کرو اچھے پیسے مل رہے ہوتے؟''

عجیب سوال تھا......سب یکا یک اداسی سے لوٹ آئے تھے۔ مسکراہٹیں کھلنے لگی تھیں......

''اب ان میں سے ہر ایک الگ الگ مکالے چرا رہا تھا......''

''فرض کرو......اچھے پیسے مل رہے ہوتے ......''

''فرض کرو......اچھی کمپنیوں میں نوکری مل گئی ہوتی ......''

''فرض کرو......شادی ہوگئی ہوتی......''

''فرض کرو...... بیوی بچے ہوتے......''

''فرض کرو......ایک اچھی خوشحال زندگی ہوتی ......''

''فرض کرو......پیسوں کی کوئی دقت نہیں ہوتی......''

''فرض کرو......اتنے پیسے ہوتے کہ ہم بینکوں میں جمع کر رہے ہوتے......''

''فرض کرو......''

حبیب تنویر نے گہری سانس کھینچی۔ جتنے چاہے فرض کرلو۔لیکن حقیقت دیگر ہے، اس نے ہماری آنکھوں میں جھانکا— فرض کرلو...... یہ حقیقت ہوتی تو...... ہم میں سے کوئی ......ادب نہیں لکھ رہا ہوتا......ادب سے کب کا سنیاس لے چکا ہوتا......کوئی شاعری نہیں کرر ہا ہوتا...... بے مطلب کی کہانیاں نہیں گڑھ رہا ہوتا...... ہماری طرح...... وہ زندگی گزارر ہا ہوتا......ایک خوشحال زندگی۔'

ترقی پسند اچانک ہی چپ ہوگیا۔فیض سقراطی کو لگا، وہ ایک دم سے ہوا نکالے غبارہ کی طرح ہلکا ہو گیا ہے۔

نازاں خیال نے میز پر زور سے ایک مکا مارا— میرا یار سچ کہتا ہے— پہلی بار سچ کہا ہے اس نے— یہی ہوگا۔فرض کرو ہم خوشحال ہوتے تو گھر کے خالی چوکے اور آنکھوں میں اتری پریشانیوں پڑھتے پڑھتے ادب نہیں لکھ رہے ہوتے—''

فیض سقراطی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ بات خطرناک ہے......مگر کم از کم ہمارے تمہارے جیسے لوگوں کے لیے سچ ہے۔آؤ مان لیتے ہیں۔ تسلیم کر لیتے ہیں۔حقیقت یہی ہے...... بے روزگاری ہی ہمیں ادب کے اس جنگل میں لائی ہے......ہم بے روزگار تھے۔اس لیے دوست بن گئے اور آپس میں چسکے کے لیے ہمیں ادب مل گیا۔سب سے سستی چیز—''

سب نے گہری سانس کھینچی اور اداس ہو گئے ہمیشہ کی طرح۔ پھر فیصلہ ہوا بالمکند شرما جوش کے یہاں چلتے ہیں— جوش صاحب کی بیٹھکی میں ان کے لیے سکون کی کرسیاں لگی ہوتیں— بیٹھ جاتے— کتابیں دیکھتے— جوش صاحب بھی خوش خوش انہیں پرانے زمانے کے مینواسکرپٹ دکھاتے، اس سے جڑی تاریخ کو بتاتے— آنکھوں میں کتنے ہی خوابوں کے جزیرے گھوم جاتے— پھر جیسے آنکھوں کے سارے پھول یکا یک اداس اور سوگوار ہو جاتے۔آنکھوں میں ایک طرح کی ناطمینانی اور بے چینی جھلملا رہی ہوتی۔

جوش صاحب آہ بھرتے......بچو...... پتہ نہیں ہمارے بعد ان سب کا کیا ہوگا؟

فیض سقراطی کہتا۔''ابھی تو آپ ہزاروں برس جئیں گے جوش صاحب......

مگر بوڑھے چہرے پر جھل مل کرتی جھریاں جیسے یہ ہزاروں برس جینے کی دعائیں خموشی سے لوٹا دیتیں۔

یہ وہ دور تھا، جب پانچوں اپنی اداسی میں خوش تھے اور خوشی میں اداس تھے— اور ان کے لیے سب سے اہم شے تھی— نوکری— ان کی سب سے چہیتی، سب سے خوبصورت ہیروئینیں تھی— نوکری— خواب، خواہشوں کے سب رستے اسی موڑ تک آکر ٹھہر جاتے تھے— اسی زمانے میں ریڈیو کی طرف سے اردو خبروں کے لیے نیوز ایڈیٹر کی ضرورت کا اشتہار نکلا— مزے کی بات، پانچوں نے یہ فارم بھرا کہ کسی کے نام تو نیوز ایڈیٹر کی لاٹری ضرور کھل جائے گی۔اور بھلا ان کی ذہانت اور قابلیت سے انکار کس کو ہوگا— ہوائی محل بنائے جانے لگے— سولہ آنے امید تو اسی دن بن گئی جب پانچوں ریٹین ٹیسٹ میں کامیاب ہو گئے— اب معاملہ تھا تو صرف انٹرویو کا— لیکن انٹرویو کے بعد معلوم ہوا کہ لاٹری تو کسی تیسرے ہی آدمی، سنتوش کمار کے نام کھلی ہے— پانچوں جیسے خوابوں کے شیش محل سے چھوٹ کر پتھریلی سڑکوں پر دھم سے آکر گرے— پھر وہی بالمکند شرما جوش کا بیٹھکا تھا اور ان کی شکایت کی عرضیاں۔

''دیکھ رہے ہیں جوش صاحب— یہ ہوتا ہے— نوکری ہمارے لیے بنی ہی نہیں تو ملے گی کیسے؟''

''سنتوش کمار—''

جوش صاحب ٹھہر ٹھہر کر بولے۔'بچو، برا مت ماننا، تمہیں ایک شکایت یہ بھی ہے نا کہ سنتوش کمال کیوں کامیاب ہوا، تم کیوں نہیں ہوئے۔ کوئی سلیمان بھائی کیوں نہیں ہوا—'

ان کے چہرے پر ایک معنی خیز ہنسی تھی— ''ٹھیک کہتے ہو۔میرے لڑکے بھی یہی کہتے ہیں— اردو ادب آپ کی زبان نہیں— مسلمانوں کی زبان ہے۔تم بھی یہی کہتے ہو۔کسی سنتوش کو کیوں لیا گیا— کسی مسلمان کو کیوں نہیں لیا گیا—''

''نہیں، ہمارا مطلب یہ نہیں تھا......حبیب تنویر اٹک کر بولا۔

جوش صاحب مسکرائے......نہیں، تمہارا مطلب یہی ہے بیٹا۔تمہاری اصل شکایت کا مرکز یہی ہے کہ تم میں سے کسی......خیر چھوڑو......ہاں اب تم نے بات صاف کردی...... ہندوؤں کی سیاسی جماعتیں بھی یہی کہتی ہیں— ہمارے لڑکے یہی کہتے ہیں۔تم یہی سوچتے ہو— غلطی تو دراصل ہم سے ہوئی۔ہم بھول گئے کہ اردو تو دراصل ہماری بھی زبان ہے— نہیں— اردو تو ہماری زبان تھی ہی نہیں— یہ ہماری بے وقوفی تھی...... یہ تو تمہاری جاگیر تھی......'

سب خاموش ہو گئے۔

کافی دیر تک ماحول میں سناٹا پسرا رہا۔اس سناٹے کا انت حبیب تنویر نے کیا۔'جوش صاحب سچ کہتے ہیں......آزادی کے بعد ہمارا سچ یہی بن گیا ہے۔تکون۔اردو، مسلمان، پاکستان— اپنی نااہلی اور کمزوریوں پر ہم سدا ہی اس جھوٹ اور وہم کو پختہ کرنے میں جٹ جاتے ہیں...... اور اس کے باوجود یہ مانتے نہیں کہ ہم Commaunal ہو گئے ہیں......

''Communal ہو گئے ہیں......''

آواز لڑکھڑا کر چپ ہو گئی—

اور جیسے اس سچ پر سب نے اپنی اپنی گردنیں نیچی کر لیں۔

●●

اتیت......

اتیت صرف سنہرا نہیں ہے......وہاں الگ رنگوں کی آمیزش ہے۔اور ان رنگوں میں محبت کا رنگ سب سے بھاری تھا...... بالمکند ٹھنڈی آہ بھرتے ہیں......وقت نے اسی محبت کو نفرت کے رنگوں سے جوڑ دیا......پھر ایک بادِ سموم چلی اور جیسے سب کچھ جھلس گیا۔

پتنی— کہتے ہیں پتنی چھایا ہوتی ہے، دکھ سکھ کی ہمراہی ہوتی ہے— مگر وہ کیسا رشتہ تھا جو جوڑتے جوڑتے بھی دونوں کو جوڑ نہیں پارہا تھا اور پھر ایک دن بچوں کے سر مہکتے سہرے کے پھول دیکھنے کے بعد پتنی نے آنکھیں موند لیں......وہ جیٹھ کی گرم دوپہر...... برآمدے میں وہ سر جھکائے بیٹھے ہیں......گم سم......بدن جل رہا ہے...... بچے رو رہے ہیں......اور وہ......

ان کی آنکھوں میں جیسے سارے آنسو جم چکے تھے......وہ کس کے لیے روئیں۔ساتھ، جنم جنم کا ساتھ کا ایسا بھی ہوتا ہے......ان کی اپنی نجی خوشیوں کے بیچ تو کب کا دائرہ کھینچ کر بیٹھ گئی تھی پتنی— وہ برسوں تک بہلا وہ دیتے رہے۔چھپائے چھپائے سے رہے خود کو......لیکن اب— ارتھی اٹھنے والی ہے......اور ان کی آنکھوں میں ایک قطرہ آنسو نہیں۔ہاں لمبا ساتھ چھوٹنے کا غم ضرور ہے......

نریندر آتا ہے۔روتے روتے اس کی آنکھیں آنسوؤں کی جھیل بن چکی ہیں......

''اب تو اپنی نفرت پونچھ دیجیے بابوجی— اماں اب جارہی ہیں۔اب واپس نہیں آئیں گی کبھی—''

وہ جیسے خواب کی وادی سے لوٹتے ہیں......اندر ایک کسک سی جاگتی ہے......آواز درد کے نغموں میں ڈوب جاتی ہے......تم سمجھتے ہو میں نفرت کرتا تھا......؟ ارے میں تو اس کی ہر خوشی میں شامل تھا...... ہاں وہی، خود میری کسی خوشی میں شامل نہ ہو سکی۔میں یہ بھی چاہتا تھا......اور وہ بھی چاہتا تھا......میں کیا چاہتا تھا، کسی کو کیا بتاؤں......مگر میں......اسے میری ہر طلب میں شک کے جراثیم نظر آتے تھے......''

وہ سوچتے ہیں......اتنی لمبی زندگی آخر انہوں نے گزاری تو کیسے؟ جیسے کوئی بدصورت خواب جسم سے آکر چمٹ جاتا ہے......جیسے کسی چھوت لگی بیماری کو جبراً جسم میں پناہ دینی پڑتی ہے......

ساتھ چھوٹ گیا......اتنی عمر کا ساتھ تھا......خود کو بہلاوہ دیتے دیتے بھی وہ رو پڑتے ہیں......سسکیوں میں......زور زور سے......ہچکیاں بندھ جاتی ہیں۔

نریندر اور انیل پاس آتے ہیں۔ کندھے پر ہاتھ رکھتے ہیں...... یہ اسپرش...... یہ لمس......وہ گھبرا کر بیٹوں کی طرف دیکھتے ہیں......

''چلئے بابو جی......''

وہ کمزور نڈھال، اپنے قدموں کو اٹھاتے ہیں......اور بیٹوں کے ساتھ چل پڑتے ہیں—

••

اتیت، بے ہنگم سا اتیت...... اب یہ اتیت کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا، مشاعرہ کے دن جو واقعہ ہوا، اس نے انہیں اور زخمی کر دیا تھا......لوگ کیا کیا سمجھتے ہیں......سمجھا کریں—

لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ بالمکند شرما جوش نام کا آدمی زندگی بھر ان کے ساتھ سازش بھرا مذاق رچتا رہا— مذاق— دراصل یہ سب، یہ جذباتی بہاؤ...... یہ تہذیبی ورثہ...... یہ سب بے معنی تھا......اس کے پیچھے کسی سازش کا ہاتھ تھا یا دوسروں کو بے وقوف بنانے کا عمل— دراصل وہ وہی ہیں......جوان کے لڑکے ہیں—

اور اس سیاسی تکڑم میں ان کی وہی بھاگے داری ہے، جو ان کے بچوں کی رہی ہے۔

بالمکند......شرما جوش......

یہ کیسی امید پر زندگی گزاری تم نے......کس امید پر......

اور...... آنکھیں جلنے لگتی ہیں......سر پھٹنے لگتا ہے...... دماغ میں جیسے بھونچال آ گیا ہے...... جتنا سوچتے ہیں......اتنا ہی وزن دماغ پر محسوس کرتے ہیں......پھر......جیسے وہ ڈوب رہے ہیں...... ذہن ڈوب رہا ہے......خود کی شناخت کے لیے وہ آئینہ کے سامنے آتے ہیں......

یہ بوڑھا کون ہے؟

کون ہے؟

وہ عجیب عجیب سی حرکتیں کر رہے ہیں......کون ہے یہ بوڑھا......

وہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں......اب ذہن میں کچھ بھی نہیں ہے...... وہائٹ پیپر کی طرح سب کچھ صاف......دھیرے دھیرے عام وحشت کی کیفیت سے وہ لوٹتے ہیں......مگر ایک عجیب سی سراسیمگی ان پر حاوی ہو رہی ہے......وہ خود کو ٹٹول رہے ہیں......وہ کون ہیں......

انہیں کچھ بھی یاد نہیں آ رہا ہے......کچھ بھی—

••

وہی ہوٹل......وہی میز

پانچوں دم بخود ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔

''ایسا کیسے ہو گیا؟''

جوش صاحب نے اس دن اچانک کیوں بلا لیا۔''

ناز اں خیال شک کا اظہار کرتا ہے......''جوش صاحب کی دماغی حالت تو ٹھیک ہے نا......؟''

حبیب تنویر میز پر مکا مارتا ہے— دماغی حالت— اس ملک میں ابھی جو کچھ ہو رہا ہے......اس سے کیا تمہاری دماغی حالت ٹھیک ہے؟ کس کی ٹھیک ہے؟ جب آنے والے کل اور مستقبل کے نام پر ہی سوالیہ نشان لگ جائے؟

فیض سقراطی سوچتا ہے— ''لیکن فکر کا مقام ہے۔ جوش صاحب اتیت میں جانے کی بات کیوں کر رہے تھے۔''

'بڑھاپے میں ہر آدمی کا سہارا اس کا اتیت ہوتا ہے۔'

احمد ربانی کی بات کو فیض سقراطی فوراً رد کر دیتا ہے— نہیں— میں نہیں مانتا— جوش اور دوسرے دقیانوسی بوڑھوں میں فرق ہے— خاص کر اس دن......تم کہہ سکتے ہو، انہوں نے ہمیں بلا کر جو ڈرامہ کھیلا— اس سے کیا ایک بہت شکستہ آدمی کی الجھن نہیں جھانک رہی تھی—''

''تم اسے ڈرامہ کیوں کہتے ہو۔''

حبیب تنویر نے پھر مکا مارا— 'جس آدمی نے ایک شاندار تہذیب کے آنگن گلیاروں میں پناہ لی ہو...... وہ سب کچھ مرتا، ختم ہوتا دیکھ رہا ہے— یہ محض ڈرامہ نہیں ہے— یہ کچھ اور بھی ہے۔

''بکواس—''

''اور وہ بھی ہمارے بھروسے— فیض سقراطی کو غصہ آ گیا۔ ہماری ادبی حیثیت کیا ہے۔''

باقر مرزا کو بھی غصہ آ گیا— 'آپ بھلے نہ سمجھیں مگر میں سمجھتا ہوں، بوڑھا ایک نمبر کا ڈرامہ باز ہے...... آخر بار بار یہ باتیں کہنے کا مطلب ہی کیا تھا کہ میں جا رہا ہوں...... میں کبھی واپس نہیں آؤں گا— مرنے کے بعد کون واپس آتا ہے بھلا—''

حبیب تنویر کچھ سوچ کر بولا— 'شاید جوش صاحب کچھ اور کہنا چاہتے تھے میں تو اپنے تجزیہ کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ — مگر— وہ اس قدر پریشان تھے اور حوصلہ شکن نظر آ رہے تھے...... کہ کچھ ٹھیک سے کہہ بھی نہیں پائے—''

باقر مرزا کسی سوچ میں ڈوب گئے۔

نازاں خیال نے رائے دی...... آج نعمان شوق کے یہاں مشاعرہ بھی ہے۔ کیوں نہ جوش صاحب کے گھر چلا جائے اور وہیں سے ان کو لیتے ہوئے مشاعرے میں جایا جائے۔''

''بہتر ہے—''

سب کو یہ رائے پسند آئی...... پھر چائے کا بل چکانے کے بعد وہ تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے......

●●

''جوش صاحب''

حبیب تنویر آواز لگاتا ہے۔ سناٹا ہے...... آواز بازگشت کرتی ہوئی لوٹ آتی ہے۔

''کوئی ہے نہیں کیا؟''

''پتہ نہیں۔''

''ذرا زور سے آواز دو—''

''جوش صاحب''

''شاید نہیں ہیں۔ پہلے تو ایک آواز میں ہی بیٹھک کا دروازہ کھل جاتا تھا۔ بات کیا ہے...... جوش صاحب۔''

تین چار آواز کے بعد اچانک دروازہ کھلتا ہے...... اور کسی طلسمی داستاں کی طرح...... بال چھترائے، آنکھیں خمار آلود، ایک بوڑھا دروازے پر کھڑا دکھائی دیتا ہے...... بالکل انجان سا—

''کون ہو تم لوگ؟''

''جوش صاحب ہیں۔''

فیض سقراطی سلام کرنے والے انداز میں دیکھتا ہے۔

''کیا چاہتے ہو؟''

''ہم آپ کو مشاعرے میں چلنے کی دعوت دینے آئے ہیں جوش صاحب۔''

جوش صاحب کھڑاک سے دروازہ بند کرتے ہیں— زور سے چلاتے ہیں۔

''میں کسی مشاعرہ وشاعرہ میں نہیں جاؤں گا۔ چلے آتے ہیں تنگ کرنے۔''

دروازہ بند ہے۔
پانچوں حیرت سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہیں۔
حبیب تنویر آہستگی سے لوٹنے کا اشارہ کرتا ہے......
پانچوں تھکے تھکے بوجھل قدموں سے لوٹ جاتے ہیں۔

ابھی عام ہے بربریت

۴ تاریخ کو اکبر پورہ میں پھر ایک واردات ہوگئی۔ کچھ لوگ ڈھول پیٹتے اور مجیرا بجاتے محلے میں داخل ہوئے۔ ان کی مجموعی تعداد ۱۰ سے ۱۵ کے بیچ ہوگی۔ ان میں زیادہ تر نوجوان طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ پہلے تو آس پڑوس کے لوگوں نے سمجھا کہ کوئی شادی بیاہ کی تقریب ہوگی، یا کوئی تماشہ ہوگا— لیکن یہ تماشہ، عام تماشوں سے مختلف تھا۔ جو نوجوان ڈھول پیٹتے اور مجیرا بجاتے نظر آرہے تھے وہ ایسے جھوم جھوم کر ناچ رہے تھے جیسے ڈھیر سارا نشہ کر رکھا ہو— ان کے ہاتھوں میں ووٹر لسٹیں تھیں۔

اکبر پورہ میں ہندو اور مسلمان ملی جلی آبادی ہے...... چھوٹا سا محلّہ ہے— مسلمان کم پڑھے لکھے ہیں— زیادہ تر چھوٹے موٹے کپڑوں کے 'تھوک بکریتا' ہیں—'

مجیرہ بجاتے اور ڈھول پیٹتے لوگ اچانک وحشت پر اتر آئے— کولڈ ڈرنکس کی دکان پر سب سے پہلے ان کا حملہ ہوا۔ سوڈا واٹر کی بوتلیں توڑی گئیں۔ کچھ بوتل عمارتوں کی جانب پوری طاقت سے چلائی گئی۔ کئی ٹوٹی ہوئی بوتل کسی کے سر پر لگی۔ کوئی چیخ کر گرا— جیسے یہ لوگ پوری تیاری سے آئے تھے۔ مشعل سلگ گئی۔ کپڑوں کی دکانوں میں آگ لگا دی گئی— ایک دکان کا مالک مولوی غفار روتا چیختا باہر نکلا تو شر پسندوں نے طاقت کے زور پر اس کا پائجامہ اتروالیا۔

کسی نے فون سے پولیس کو اطلاع بھیج دی۔ دس پندرہ منٹ میں شر پسندوں کی یہ ٹولی جو کر گزر سکتی تھی، وہ اس نے کیا— جب تک پولیس آتی چار پانچ لوگ زخمی حالت میں چھٹپٹا رہے تھے۔ مسلمانوں کی دو دکانیں پھوکی جا چکی تھیں۔ یہ کون لوگ تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ پوچھے جانے پر بھی ان باتوں کا صحیح صحیح جواب نہ مل سکا۔ آناً فاناً دکانیں بند ہونے لگیں۔ شٹر گرنے لگے۔ سڑک پر بھاگم بھاگ مچ گئی— گھروں کے دروازے، کھڑکیاں بند کر دیئے گئے۔ کہیں سے رونے اور چلانے کی آواز بھی گونجنے لگی تھی۔

دیکھتے دیکھتے سناٹا چھا گیا۔ اکا دکا لوگ کھڑے تھے جن سے پولیس پوچھ تاچھ کر رہی تھی۔ زخمی لوگوں کو اسپتال پہنچایا گیا— جس میں سے ایک کے آدھے گھنٹے بعد مرنے کی خبر بھی آ گئی—

ایسا کہا جا رہا تھا کہ یہ سب منصوبہ بند طریقے سے ہوا تھا۔ اکبر پورہ میں کپڑوں کے یہ چھوٹے چھوٹے دکاندار مسلمان طبقے سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ ان کی دکانداری اچھی چل نکلی تھی۔ شہر دیہاتوں سے بھی ان کے مستقل گاہک بندھے ہوئے تھے— پچھلے دنوں لگاتار ہونے والی سبھاؤں نے محلے میں گرمی تو بھر ہی دی تھی۔ مگر یہ سب اتنے انوکھے طریقے سے ہوگا، کس نے سوچا تھا— یہ ڈھول پیٹنے اور مجیرا بجانے والے کون

لوگ تھے،اس کے بارے میں بھی اٹکلیں لگائی جارہی تھیں— کچھ لوگ اسے بھاجپا سے جوڑ رہے تھے—اور جوڑنے کے پیچھے ان کی دلیلیں یہ تھیں کہ کچھ دن پہلے شہر کے مختلف مقامات پر ہونے والی سبھاؤں اوران میں دیئے جانے والی اشتعال انگیز تقریروں میں بھاجپا کا ہی ہاتھ تھا— کچھ نے دس پندرہ لوگوں کی اس بھیڑ میں گیروا کپڑے پہنے اور ٹیکا لگائے لوگوں کو بھی دیکھا تھا۔ جبکہ پولیس بہت زیادہ انہیں لٹیرا ماننے کو تیار تھی—چوری اور ڈاکے کے نئے نئے طریقے عام ہیں— مگر ایک بات اور بھی تھی۔حملہ میں جو دکان لوٹی یا جلائی گئی وہ مسلمانوں کی تھی۔ جولوگ زخمی ہوئے وہ بھی مسلمان تھے—

لٹیروں کے ہاتھ میں ووٹر لسٹ تھی۔اس بارے میں محلے والوں کا سوچنا تھا کہ منصوبہ کے مطابق ووٹرلسٹ سے دیکھ دیکھ کر وہ مسلمانوں کی شناخت کرنے اورانہیں مارنے کے ارادے سے آئے تھے۔مگر کامیاب نہ ہوسکے۔اورانہیں الٹے پاؤں واپس بھاگنا پڑا۔

محلّہ میں مردنی چھا گئی،ایک خوفناک سناٹا گھر کے در وبام پر چھا گیا۔دنگوں کے پچھلے ریہرسل کی یاد لوگوں کے دلوں میں تازہ تھی۔لوگ ضرورت سے زیادہ ڈرے ہوئے تھے۔

منا اس وقت بجلی آفس میں تھا۔ جب یکا یک بل والی کھڑکی سے اسے دور سے نیل کنٹھ کا چہرہ نظر آیا جس کی جیپ باہر رکی تھی۔ ہاتھ میں سگریٹ دابے نیل کنٹھ اسی کی طرف آ رہا تھا۔

بل والی کھڑکی پر ابھی بھی قطار لگی تھی۔

نیل کنٹھ نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا۔اس نے شارہ کیا......بس کھڑکی پر کچھ ایک لوگ ہیں......انہیں نمٹا کر تم سے بات کرتا ہوں۔'

اس نے کندھے اچکائے۔ایک ستون کی آڑ میں کھڑا ہوکر سگریٹ پینے لگا۔

قطار میں کھڑے لوگوں کو جلدی جلدی نپٹا کر منا باہر نکلا نیل کنٹھ نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ دبایا۔

''اور۔سب ٹھیک تو؟''

''ہاں۔''

''اوئے۔اتنا کھویا کھویا کیوں رہتا ہے۔''

''کچھ نہیں یار۔''

منا نے مسکرانے کی کوشش کی۔

نیل کنٹھ کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔جیب میں ہاتھ ڈالا۔سو والے چار نوٹ نکالے۔اس کی مٹھیوں میں پھنسایا۔

''لے، پکڑ نا۔''

منا نے حیرانی سے پوچھا— ''وہ کس لیے؟''

''تو کیا سمجھتا ہے۔پارٹی کے پاس فنڈ کی کمی ہے۔''

''مگر یہ کس لیے ہیں۔''

''ڈاکٹر نریندر نے بھجوایا ہے۔وہ پھسپھسایا— ڈاکٹر نریندر کہتے ہیں مسلم محلوں میں تمہاری تقریر بہت کام کی رہی— بھاجپا کے لیے ان کے دل کا میل تھوڑا سا مٹا ہے۔انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ میں جب تب تمہاری مدد کرتا رہوں۔تم سے پوچھتا رہوں......تمہیں پیسوں وغیرہ کی ضرورت تو نہیں ہے......''

منا نے چونک کر نیل کنٹھ کو دیکھا۔

نیل کنٹھ نے سگریٹ کی راکھ تھوڑی سی جھاڑی......ڈاکٹر نریندر بڑے خوش ہیں تم سے،کیا جادو کر دیا ہے تم نے ان پر—یہ طے ہے کہ ان کو ٹکٹ ملیگا اس بار—میرا تمہارا سب کا بھوش چمکے گا—اور پیسے چاہئے تو......''

''نہیں......''

منا کا لہجہ برف جیسا سرد تھا اس بار۔

''ہاں ایک بری خبر ہے۔ممکن ہو تو گھر چلے جاؤ ابھی ...... یا چلو میں چھوڑ دوں۔'' نیل کنٹھ دھیرے سے پھسپھسایا— اکبر پورہ میں فساد ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کرفیو لگ جائے۔ میں صرف تم کو خبر دینے آ گیا—''

منا کا دل بیٹھ گیا۔

''کب ہوا فساد؟''

''ابھی کسی کا نقصان نہیں ہوا ہے۔مگر تم جانتے ہو فضا خراب ہے۔اس لیے کرفیو تو لگ ہی جائے گا''

''تم چلو، میں آتا ہوں۔''

نیل کنٹھ نے سگریٹ کا ٹکڑا چپل سے مسلا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

''اچھا۔''

اس نے گاڑی اسٹاٹ کر دی......

منا کچھ دیر تک گاڑی کے چھوڑے دھوئیں سے نہا تا رہا— ''دل پر میل سی جم گئی تھی۔ بدن میں لرزہ سا طاری ہو گیا تھا— پھر فساد ہو گیا۔ ڈاکٹر نریندر، سدھیند ورائے، نریندر وغیرہ اسے اپنے ساتھ مسلم محلوں میں بھی لے گئے تھے۔ایک نوجوان مسلم بھاجپا کاریہ کرتا کے طور پر اس کا تعارف کرایا گیا تھا— اور اس نے کہا تھا— بھاجپا ہی ہے جو آپ کے حقوق کی صحیح طور پر حفاظت کر سکتی ہے......انہیں خوف نہیں کھانا چاہئے—''

ف......س......اد......ہو......گیا......

اسے اپنی ہی آواز گھٹتی ہوئی لگی......فساد......چھوٹے چھوٹے بے قصور بچوں کی اموات......لاشیں ہی لاشیں......عورتوں، کم سن لڑکیوں کے ساتھ زنا بالجبر......جھلسے ہوئے گھر......چیخیں......گھروں سے اٹھتا ہوا دھواں......چاروں طرف خون کے اڑتے ہوئے چھینٹے......اور......چھوٹے چھوٹے بچے......

وہ صرف......تصور کے پردے پر چھوٹے چھوٹے بچوں کو دیکھ رہا تھا......

نشی بھی چھوٹی ہے......چھوٹی سی بچی......

فساد ہو گیا......بلوائی اس کے گھر کی طرف بڑھ رہے ہیں......نہیں— اسے کچھ نہیں ہوگا......وہ تو......ان کا ہی آدمی ہے......کچھ ہوا بھی تو اسے کچھ نہیں ہوگا......اسے کیا خبر تھی، اپنی دور اندیشی میں اس نے جو پانسہ چلنے کی کوشش کی، وہ کہاں گرے گا......وہ تو آنے والے کل کو آج ہی محسوس کرنا چاہتا تھا۔ سب سے پہلے— دوسرے کے جاگنے سے پہلے......مگر یہاں......

'بہت اندھیرا ہے......تحسین حسین......'

'بہت گھٹن ہے......'

میں اپنے ہی لوگوں کے درمیان اجنبی ہونے لگا ہوں......سب مجھ سے جیسے نفرت کرنے لگے ہوں......مجھے ایسے دیکھتے ہیں، جیسے کوئی عجوبہ ہوں......یا سرکس کا جوکر......یا......کوئی ہتھیارا خونی......

مگر......

یہ سچ بھی ہے— میں لوٹ نہیں سکتا ہوں۔ میں پابہ زنجیر ہو رہا ہوں......میں واپس نہیں ہو سکتا......

جیسے کوئی آنسو آنکھوں آنکھوں میں کانپ کر دم توڑ گیا......

وہ تیزی سے اندر آیا......

رام بلاس بابو اپنی میز پر تھے۔اس نے جلدی جلدی فائلیں سمیٹیں— رام بلاس بابو سے بولا۔

''بڑے بابو......'میں چلا— اور آپ بھی کھسک لیجئے۔ شہر کی فضا اچھی نہیں ہے......''

باقی میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اس سے پہلے کہ چونک کر اس کی طرف دیکھیں وہ تیزی سے باہر نکل گیا—

●●

چودھری برکت حسین گم سم سے رہتے—اب ان کا اپنا حجرہ تھا اور وحشت تنہائی تھی—ہونٹ سل گئے تھے۔

''ابا چائے لاؤں۔''

شمیم ابا کے اس بدلے ہوئے تیور کو لے کر خوفزدہ تھی—پہلے وہ بول بک لیتی تھی تو ابا ہی تھے، جو مزاج پرسی کرتے تھے۔ خیر خبر لیتے تھے۔ کبھی منا ڈانٹ دیتا تھا اور وہ چیخ چیخ کر دیہاتی عورتوں کی طرح رونا شروع کر دیتی تھی۔ تب بھی ابا ہی تھے جو بیٹی بیٹی کرتے آتے اور اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے—اماں کی تو اپنی دنیا ہے۔ ذرا سا پریشان ہوگئیں تو کلام پاک نکال لیا۔ ساس ہیں اس لئے ڈانٹنا اور ناراض ہونا بھی اپنا حق سمجھتی ہیں۔ مگر ابا......مگر ابا تو بالکل جدا ہیں، مختلف ہیں......

''ابا چائے لاؤں۔''

ابا چپ رہتے ہیں تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا ہے......اور تو ادھر......ادھر گھر میں کیسی نحوست پھیلی ہے۔ اور وہ بھی آتے ہیں تو بس گم سم۔ کسی سے کچھ کہتے نہیں۔ اس سے بھی زیادہ بات نہیں کرتے۔ بس کبھی کبھی نشی کو اٹھا کر پیار کر لیا، بس—پھر لیٹ گئے۔ یا ٹہلتے رہے......رات میں جب بھی وہ چونک کر اٹھتی—منا کو ٹہلتے پاتی—

کتنی ہی بار خود پر جبر کر کے اس نے پوچھا۔

''آپ کیسے آدمی ہیں۔ بتاتے کیوں نہیں، کیا ہوا ہے؟ ارے کچھ بولیے گا نہیں تو دل کا بوجھ کیسے ہلکا ہوگا—''

''ماتھا مت چاٹو۔ سو جاؤ۔''

''ان کا بس یہی جواب ہوتا—''

''آپ ٹہلتے رہیں گے تو مجھے کیسے نیند آئے گی صبح میں آفس بھی جانا پڑتا ہے اور آپ سوتے ہی نہیں—''

''میں نے کہا نا—سو جاؤ۔''

منا دہاڑ مارتا تو وہ روتی دھوتی چپ ہو جاتی—

ہاں۔ اس رات، اس نے دیکھا۔ وہ چپکے چپکے سسک رہے تھے۔ اس کی آہٹ پاتے ہی جیسے ان کے آنسو بند ہو گئے—پتھر ہو گئے۔

وہ ساڑی برابر کرتی قریب آئی—گاؤں کی عورت، محبت کی ادا اور زبان سے انجان تھی......قریب آ کر کھڑی ہو گئی—

''رو رہے تھے کیا؟''

منا بپھر گیا۔

''روؤں گا کیوں......سو جاؤ۔''

لیکن وہ بستر پر نہیں گئی—''مجھے لگا، آپ رو رہے ہیں۔''

''پاگل ہو گئی ہو۔''

وہ بھی جواب میں چیخی—''پاگل ہو نہیں گئی ہوں۔ آپ نے کر دیا ہے۔ یہ سب کیا ہے—کیسا روگ ہے—؟''

''چیخو مت۔ ابا جاگ جائیں گے۔''

منا جیسے ذہنی اذیت سے پریشان تھا۔

''اب تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ کیا ہوا ہے......بس......مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ اور میری قسم کچھ مت پوچھو—''

میری قسم—سب کچھ ہوتے ہی بس اس قسم تک پہنچتے پہنچتے وہ بے سدھ ہو جاتی ہے۔ میاں نے آگے پوچھنے کا دروازہ ہی بند کر دیا۔ آنکھیں پوچھتی وہ بستر پر لیٹ گئی—تھوڑی دیر بعد منا بھی آ کر بستر پر لیٹ گئے......

رات میں وہ دیکھتی......ادھر میاں جی کا بڑبڑانا پھر شروع ہو گیا تھا، مگر آدھے ادھورے لفظوں کو بھلا وہ کیا سمجھتی ہے اور اب میاں نے قسم ایسی دے دی تھی کہ کچھ پوچھتے ہوئے بنتا نہیں تھا۔

میاں، گم سم تھے تو ابا خیر خبر لیتے رہتے تھے......لیکن ادھر کچھ دنوں سے وہ ابا کو بھی کسی اور ہی دنیا میں گم دیکھ رہی تھی......

اسے وحشت سی ہو رہی تھی۔

یہ اس گھر کو کس کی نظر لگ گئی ہے؟ پورے گھر میں جیسے نحوست کا ڈیرہ لگ گیا تھا۔ بھوت بنگلہ — سارے کے سارے جیسے بھوت بن گئے تھے۔ ہلتے ڈولتے۔ چلتے پھرتے......لیکن بولتے نہیں تھے......

''ابا، چائے لاؤں —؟''

وہ ڈرتے ڈرتے ابا کے پاس آئی۔

ابا نے نظر اٹھائی۔

اس نے دھیرے سے کہا، 'ابا۔ باہر شور ہے......کچھ لوگ کہتے ہیں پھر دنگا ہو گیا۔'

ابا اٹھے —

''ہاں چائے رکھ دو۔ ابھی آیا۔''

ابا باہر نکل گئے۔ کچھ ہی دیر میں لوٹ آئے۔ پریشان تھے۔

''ہاں دکانیں بند ہو گئی ہیں — تحسین آیا؟''

تحسین — وہ ایک دم سے چونک گئی۔ ابا کے منہ سے کبھی بھی اس نے تحسین نام نہیں سنا تھا۔ ابا منا ہی کہتے تھے۔ ابا نے تحسین کہا تو اسے بھی اجنبیت کا احساس ہوا۔ پہلے تو وہ سمجھ ہی نہیں پائی۔ پھر دھیرے سے بولی۔

''نہیں۔''

''آ جائے گا۔ فکر مت کرو۔''

ابا کے لہجے میں اعتماد تو تھا لیکن اس اعتماد میں طنز بھرا تھا۔ طنز، یا یہ طنز اس نے محسوس کیا۔

وہ کھڑی رہی —

ابا پھر اسی اعتماد یا طنز سے دوبارہ بولے۔

''بہو۔ گھبراؤ مت، آ جائے گا۔ جاؤ آرام کرو۔''

شمیم آگے بڑھی تو ابا کی آواز نے روک لیا۔

''وہ......کیا ہے......'' ابا جیسے کچھ کہنے کے لیے لفظ جوڑ رہے تھے......اس دن بہو......تم نے کچھ کاغذ پتروں کے بارے میں کہا تھا۔ تحسین جسے پلنگ کے نیچے رکھتا ہے، ہونگے کیا؟'

''پتہ نہیں......'' شمیم کے لہجے میں حیرت تھی......

''چلو......دیکھتا ہوں......''

برکت حسین کا لہجہ کٹھور تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر شمیم نے پلنگ کے نیچے سے اخبار کے ڈھیر سے کچھ کاغذات نکالے جو آرام سے، 'سنیت' کر اس طرح رکھے گئے تھے کہ کسی کو پتہ نہ چلے — یہ کچھ اشتہارات تھے......برکت حسین اچانک کانپ سے گئے۔ ان میں دو تین چھپے ہوئے رنگین، پوسٹر تھے......

ان پر جیسے اندھیرا چھا رہا تھا......

مشاعرے میں بوڑھے میاں کا جملہ اچانک ان کے سامنے کسی پھینکے گئے پتھر کی طرح لہرایا......آپ کو کیا فکر ہے برکت حسین۔ آپ کا لڑکا

بھی تو آخر بھاجپا کا......

ہاتھ کانپ گیا۔ شمیم چونک کر تعجب سے ابا کو دیکھ رہی تھی۔

ٹھیک اسی وقت دروازے پر دستک پڑی......

دروازہ کھولو......

یہ منا کی آواز تھی—

برکت حسین نے بت بنے ہوئے انداز میں کہا—

''جاؤ دراز ہ کھول دو— اندر آنے دو۔''

شمیم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ تیزی سے لہراتا ہوا منا اپنے کمرے میں آگیا اور اچانک دم بخود سا ابا کو دیکھنے لگا......

جو پوسٹر اور اشتہارات ہاتھوں میں لیے کسی سنگ کی مانند کھڑے تھے۔

منا کی آنکھوں میں بجلی سی لہرائی۔ اس نے پلٹ کر شمیم کی طرف دیکھا۔

''یہ سب آپ کو کہاں سے ملا؟''

برکت حسین چیخ پڑے— ''تحسین حسین، سوال اس کا نہیں ہے۔ یہ کہاں سے ملا یہ کیا ہے؟''

''تم نے نکال کر دیا ہے؟'' منا غصے میں شمیم کی طرف مڑا۔

برکت حسین دوبارہ چیخے۔ ''میں پوچھتا ہوں یہ سب کیا ہے۔''

منا نے کسی پکڑے گئے مجرم کی طرح اقرار کیا—

''یہ وہی ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ اس سے آگے مت پوچھیے گا۔''

برکت حسین کی آواز لرز گئی— ''اب پوچھنے کو بچا کیا ہے۔ تحسین حسین۔ صرف ایک سوال اور اپنا نام کب بدل رہے ہو تم؟''

منا دھم سے بستر پر بیٹھ گیا—

''ابا۔ ابھی آپ للّٰہ کمرے سے چلے جائیے۔''

اس کا ہر لفظ موم کی طرح پگھل رہا تھا...... میں کچھ جواب دینے کی حالت میں نہیں ہوں۔

''تم جواب کیا دوگے۔ جواب تو یہ ہے۔''

برکت حسین نے غصے میں اشتہارات اور پوسٹر زمین پر دے مارا۔ غصے میں پلٹتے ہوئے بولے......

تحسین حسین۔ اب ہمیں سوچنا پڑے گا۔ تمہارے ساتھ رہنا چاہئے یا نہیں— باہر دنگے بھڑک رہے ہیں......اور جو بھڑکانے والے ہیں تم ان میں سے ہی ایک ہو— ڈاکو کب اپنا گھر پھونک ڈالے، کون کہہ سکتا ہے—

وہ تیزی سے باہر نکلے—

منا کسی زخمی کی طرح بستر پر گر گیا— یہ سب؟ اسے حیرت نہیں ہونی چاہئے تھی...... یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا......مگر— سب کا لہجہ یکساں کیوں ہے...... جیسے وہ کوئی ڈاکو ہو، انتہا پسند ہو، دہشت گرد ہو— ابا بھی اسے نام بدل لینے کی صلاح دیتے ہیں— اس کی دانش مندی، دوراندیشی، آنے والے کل کو آج پہچان لینے کی صلاحیت......سب جیسے زنگ کھا گئی تھی......اسے رونا آرہا تھا۔

دروازے پر شمیم روتی ہوئی نشی گود میں لیے عجیب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی......

منا کو وحشت ہو رہی تھی......اپنے آپ سے وحشت ہو رہی تھی...... جیسے وہ سب کچھ چھوڑ کر کسی دشت بیاباں میں نکل جائے، مگر کہاں...... بیوی بچے......دل میں جانے کتنی بار خودکشی کا خیال بھی آیا— مگر بیوی بچوں کا خیال اسے زندہ رکھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اور وقت، حالات جیسے اس کا مذاق اڑانے پر تل گئے تھے......ایک جال اور وہ پھنس گیا ہے......چارہ پھینکنے والوں نے اسے اس طرح پھانس لیا ہے کہ وہ باہر نہیں نکل سکتا......

مگر یہ...... وہ کسے سمجھائے...... کسے بتائے...... کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کیسی قید میں سڑ رہا ہے......

اس دن......اس دن کا سارا منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔

●●

نیل کنٹھ کے گھر پر میٹنگ تھی— سدھیند ورائے، ڈاکٹر نوینِدو، نریندر اور دیگر بہت سے لوگ جمع تھے—

منا نہیں آیا—

منا ابھی دروازے ہی پر تھا کہ ڈاکٹر نوینِدو کی آواز لہرائی۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

سدھیند ورائے کی آواز تھی— ''چھوٹا سا شہر ہے۔ اس بیچارے کا باہر نکلنا مشکل ہو گیا ہے—''

نریندر کی برف کی طرح ٹھٹھری آواز تھی۔ جب تک ہمارے کام کا ہے۔ کام ہے۔ نہیں ہوگا تو اسے بھی فساد میں مروا دیں گے—

''اس نے قہقہے کی آواز سنی—''

ڈاکٹر نوینِدو نے کہا— چھوٹے شہر میں یہی تو مصیبت ہے— ہماری پارٹی کو لوگوں نے مسلمانوں کا دشمن تصور کر لیا ہے—

''دشمن تو ہے ہی؟''

نریندر نے ٹھہاکا لگایا— ''ہم جو بھی چال چلتے ہوں۔ الٹ پلٹ کر بیان دیتے ہوں— مگر جیت کی ابتدا تو انہی کے سینے پر مونگ دل کر کی ہے— اتنے سارے لوگ مسلمانوں کے ورودھ تو ہمارے حصے میں جٹے ہیں—''

''منا کو ایک بھڑکاؤ بھاشن کے لیے تیار کرنا ہے؟'' یہ نریندر کی آواز تھی—

ڈاکٹر نوینِدو پوچھ رہے تھے— ''وہ تیار ہوگا—''

''تیار اس کا باپ ہوگا— اب الٹ پلٹ کیا تو ہم دھمکانے سے بھی باز نہیں آئیں گے''

''وہ پول بھی تو کھول سکتا ہے۔''

''اس کو اپنی جان کا خطرہ نہیں ہے۔''

منا دبے پاؤں وہاں سے واپس لوٹ گیا— اس وقت صبح کے دس بج رہے تھے— وہ سیدھا بجلی آفس پہنچ گیا۔ ساڑھے بارہ بجے کے لگ بھگ نیل کنٹھ جیپ اڑاتا وہاں پہنچ گیا۔ یہ منا کا آخری فیصلہ تھا۔ اب وہ پارٹی کارِیالیہ نہیں جائے گا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ نیل کنٹھ کو دیکھ کر دل ہی دل میں اس نے فیصلے کا موڈ بنا لیا تھا۔

ابھی اس کے کاؤنٹر پر لوگ تھے— اس نے نیل کنٹھ کو باہر ہی رکنے کو کہا۔ مگر نیل کنٹھ تیر کی طرح اندر گھس آیا۔

''میں نے کہا تھا نا۔ باہر انتظار کرو۔'' اس نے اپنے لہجے کو مضبوط بنانا چاہا—

''کیوں۔ یہاں اندر آنا منع ہے۔''

نیل کنٹھ کے ہونٹوں پر ایک زہریلی ہنسی مچل رہی تھی—

''اچھا چلتا ہوں—''

کاؤنٹر پر کھڑے لوگوں کو دو منٹ شانت رہنے کا حکم دے کر وہ باہر آ گیا۔ کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے لوگ ہلا غلہ کر رہے تھے۔

وہ باہر نکل آیا اور مضبوط آواز میں بولا—

''میں نے تمہاری پارٹی چھوڑ دی۔ اب یہاں میرے پاس مت آیا کرو۔''

نیل کنٹھ پھر ہنسا— میاں۔ ہم پہلے ہی سمجھ گئے تھے۔ جب تم ہماری پارٹی میں نہیں آئے۔

''بس چھوڑ دی۔''

نیل کنٹھ نے گالی دینے والے انداز میں بے رحمی سے اس کے ہاتھ کے گٹھے کو تھام لیا۔

''ارے یہ کیا کرتے ہو۔''

نیل کنٹھ نے ہاتھ کو بے رحمی سے مروڑتے ہوئے چھوڑ دیا— میاں جی۔ ایک تو اب یہ سوچو مت۔ جب ساتھ ہو لیے ہو تو پھر ہو لیے ہو۔ اب ایسا سوچیو مت—

وہ گندی اور بازاروز بان پر اتر آیا تھا۔ اتنا تو تم کو معلوم ہو ہی گیا ہوگا کہ ہم اچھے لوگ نہیں ہیں۔ ہم قاعدہ قانون کچھ نہیں جانتے— اب جو ہوگا سو برا ہوگا۔ اتنا سمجھ رکھو۔ تم پیار سے مل رہے ہو تو سمجھو آج ہمارے تمہارے بیچ کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ لیکن تم چھوڑنے کی بات کر رہے ہو تو یہ اسمبھو (ناممکن) ہے—'

''میں نے چھوڑ دی۔''

منا نے پھر زور دیا۔

نیل کنٹھ نے کسی بچے کی طرح اس کا کندھا سہلایا۔ پریوار والے ہو۔ اتنی جلدی ڈیسیزن نہیں لیتے۔ میرے اچھے منے۔ جا...... دیکھ بل کاؤنٹر پر لوگ ہلہ کر رہے ہیں۔

وہ سگریٹ پی کر کسی فلمی ویلن کی طرح ہنسا۔ پھر جیپ اسٹارٹ کر دی—

منا کو لگا، بہیلیا کے بچھائے ہوئے جال میں وہ کسی کبوتر کی طرح پھنس گیا ہے...... اب سب کچھ بہیلیا کے اختیار میں ہے۔ وہ اسے آزاد کرتا ہے یا......

●●

شام میں وہ پارٹی دفتر میں تھا۔

نیل کنٹھ نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ دیا۔

''چلو باہر چائے پیتے ہیں۔''

''چلو۔''

وہ دھیرے سے مسکرایا—

چائے پیتے ہوئے نیل کنٹھ نے پوچھا—

''اب ٹھیک تو ہو؟''

''ہاں—''

''اس نے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھا— میری صبح والی بات کا برا تو نہیں مان گئے؟''

''صبح میں؟ ہم ملے تھے کیا؟''

منا ایکدم سے انجان بن گیا۔

نیل کنٹھ ٹھٹھا کر ہنسا۔ بالکل صحیح جا رہے ہو دوست— جو صبح میں ہوا اسے شام میں بھول جانا چاہئے۔ یہی پالیٹکس ہے—

''میں کیا بھول گیا مجھے تو یہ بھی یاد نہیں—''

نیل کنٹھ ہنس رہا تھا—

نیل کنٹھ ہنس رہا تھا۔ ''پارٹی کو تمہارے جیسے آگیا کاری پتروں کی ضرورت ہے۔ چلو اندر چلتے ہیں۔ ڈاکٹر نویندو تمہیں کھوج رہے تھے۔''

●●

بالمکند شرما جوش آنکھیں بند کئے بستر پر پڑے ہیں۔ انیل سرگوشیوں میں تلسی سے کچھ باتیں کرتا ہے...... پھر بابو جی کے پائتانے بیٹھ جاتا ہے۔

'طبیعت کیسی ہے باؤجی؟'

بالمکند دھیرے سے آنکھیں کھولتے ہیں......انیل کوٹٹولتے ہیں۔ پھر آنکھیں بند کر لیتے ہیں......

''باؤجی۔ میں ہوں انیل......''

بالمکند دیکھتے ہیں......آنکھوں میں اجنبیت سی سمٹ آئی ہے۔ پہچاننے کی کوشش کرر ہے ہیں——

نریندر ڈاکٹر کو لے کر آجاتا ہے۔ ڈاکٹر دونکررائے پڑوس میں ہی رہتے ہیں—— دونکررائے بالمکند کا ہاتھ پکڑ کر بلڈ پریشر چیک کرتے ہیں۔ بالمکند آنکھیں کھول کر اس پورے عمل کو دیکھے جارہے ہیں۔

دونکررائے پوچھتے ہیں......اور شاعری چل رہی ہے آپ کی......

بالمکند جواب نہیں دیتے۔

دونکررائے اپنا سامان سمیٹتے ہیں—— نریندر کو کنارے لے جاتے ہیں پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہیں۔

''بالکل نارمل۔ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔''

''پھر یہ سب؟''

ڈاکٹر دونکررائے مسکراتے ہیں—— بوڑھے ہو گے تب پتہ چلے گا نریندر—— یہ کوئی بیماری نہیں ہے الزیمرس کہتے ہیں اس کو۔ اکثر بوڑھاپے میں اس کا روگ ہو جاتا ہے۔ یادداشت اس حد تک کمزور پڑ جاتی ہے کہ آدمی کبھی کبھی خود کو بھی نہیں پہچان پاتا۔ کئی دلچسپ باتیں ہوتی ہیں اس مرض میں۔ وہ بھول جاتا ہے کہ جانا کہاں ہے۔ باتھ روم جانا چاہتا ہے تو کہیں اور چلا جاتا ہے۔ کبھی کبھی کچھ گڑ بڑ بھی کر بیٹھتا ہے...... بٹ نارمل انہیں کچھ نہیں ہوا ہے۔ کچھ بھی سریس نہیں ہے......

''لیکن ایسا کب تک چلے گا——''

نریندر! دونکررائے مسکراتے ہیں۔ عمر ہو گئی ہے پتا جی کی۔ اب وہ بھولنے کی استھتی میں آ گئے ہیں۔ انہیں پریشان مت کرو بس یہی علاج ہے۔

الزیمرس......نریندر دہراتا ہے......

''پریشان مت ہونا۔ کیئر کرنا۔ ہاں......'' اپنے خاص بنگالی ٹون میں ہندی بولتے ہوئے دونکررائے بہت معصوم لگتے ہیں......

دونکررائے کے جانے کے بعد بالمکند اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اوما چائے لے کر آتی ہے——

''پتا جی چائے۔''

تیزی سے ہاتھ بڑھا کر وہ چائے پینے لگتے ہیں۔

نریندر غور سے انہیں دیکھتا ہے جیسے وہ پتا جی اور ان کی بیماری کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو——

●●

نیلگوں آسمان......دور تک پھیلا ہوا......

بالمکند بالکنی سے اسی آسمان کا نظارہ کر رہے ہیں......دماغ پر زور ڈال کر کچھ سوچنا چاہتے ہیں مگر......

وہ واپس اپنے کمرے کی طرف لوٹتے ہیں۔ شیلف میں کتابیں سجی ہیں۔ ایک ایک کر کے کئی کتابیں وہ اپنے ہاتھ میں اٹھا لیتے ہیں۔ الٹتے پلٹتے ہیں۔ پھر ویسے ہی چھوڑ دیتے ہیں کچھ دیر تک خالی کرسی پر بیٹھتے ہیں۔ پھر آئینہ کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

''ددو——''

دروازے سے مالو جھانک رہی ہے۔ مالو دوڑ کر ان کے پاس آتی ہے۔

''تم اچھے نہیں ہو ددو۔ اب تم بات بھی نہیں کرتے۔''

گال پھلا کر وہ ہوپ کرتے ہیں مالو کو......دھیرے سے مسکراتے ہیں۔ پھر اپنے سینے سے سٹا لیتے ہیں ایک قطرہ آنسو کہیں آنکھوں میں چھلکتا ہے......مگر اس آنسو کو کس نے دیکھا ہے۔ کب سمجھا ہے۔ دیر تک لپٹائے رہتے ہیں مالو کو......''

مالو دو کے ہاتھوں کو آزاد کرتی ہے......میں جا رہی ہوں پڑھنے ۔تم بھی پڑھنا دو......'

وہ بھاگ جاتی ہے۔......

بالمکند بس ہونٹ دابے خالی دروازے کو گھورتے رہ جاتے ہیں۔ اچانک آنکھوں کے آگے سائے سے لہراتے ہیں...... چیخ و پکار کی آوازیں گونجتی ہیں......آسمان میں پھیلتا دھواں سا دیکھتے ہیں وہ......

ایک بار وہ پھر میز پر ہیں......

خود سے باتیں کر رہے ہیں...... یہ کیا ہو جاتا ہے مجھے......میں......کیا سچ مچ مرنے والا ہوں......نہیں......ابھی نہیں مروں گا......ابھی ایک بیان دینا ہے مجھے......بیان...... پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ......شاید صاف صاف کہہ دینا چاہئے مجھے—'

ایک بار پھر وہی میز ہے۔قلم، کاغذ سب سامنے ہے۔قلم ہاتھوں میں تھامتے ہیں— لکھنے لگتے ہیں......

بھولنا کسے پسند ہے؟

مجھے— مجھے پسند ہے اب— اچھا لگتا ہے بھولنا......سب کچھ بھول جانا بچے اور ڈاکٹر سب سمجھتے ہیں— میں بوڑھا، بے بس اور لاچار ہو چکا ہوں......انت سامنے ہے......مگر میاں......ابھی نہیں مرنے والا میں......ابھی نہیں مروں گا......

وہ ٹھہرتے ہیں۔ پھر لکھتے ہیں— مجھے سوچ کر وحشت ہوتی ہے کہ میں اب بھی جی رہا ہوں— اس خوفناک آندھی میں، تیز و تند ہواؤں میں، بر فیلے جھکڑوں میں— بڑی آزمائش سے گزر رہا ہوں میں......خود کو بچائے اور زندہ رکھا ہے...... یہ بہت ہے میاں— مجھے تو کب کا مر جانا چاہئے تھا— اور سچ ہے......جوش تو کب کا مر چکا ہے— کچھ میں نے...... کچھ میرے بچوں نے اسے مار ڈالا لیکن— ابھی سانس باقی ہے اس میں— تھوڑی سی......اسے زندہ رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر میں جانتا ہوں...... بہت دن تک یہ کوشش جاری نہیں رکھ سکتا میں— جوش بالآخر مر جائے گا ایک دن...... مجھے وحشت ہو رہی ہے......میں اپنے سارے دوستوں کو کھا چکا......جیتندر جین......سردار یشونت راؤ بے داغ، کلونت سنگھ حاتم......سب جانے کہاں، کن وادیوں میں گم ہو گئے— تاریخ بن گئے......اب صرف یاد کرنے کا غم جھیلنے کے لیے یہ جوش بچا ہے......اور میاں جوش......اور جوش کا بھی کیا ٹھکانہ......رختِ سفر تو کب کا باندھا جا چکا—

وہ ٹھہرتے ہیں......پھر لکھتے ہیں...... میں دیکھ رہا ہوں......وہ پھیل رہے ہیں......وہ چاروں طرف سے پھیل رہے ہیں......اور ایک دن وہ آسمان، زمین، چٹان، نالے، سمندر سب کو ڈھک لیں گے......سب جگہ حاوی ہو جائیں گے وہ......صرف وہ رہیں گے اور......سب کچھ ختم ہو جائے گا......کوؤں اور گدھوں کی حکومت رہ جائے گی بس۔ سوچتا ہوں تو جیسے سب کچھ بھول کر اپنے ہوش کھو بیٹھتا ہوں۔ پھر کسی کو پہچان نہیں پاتا......ہوش آتا ہے تو نظریں، سب کو پہچان تو لیتی ہیں پھر خود پر افسوس آتا ہے کہ نہ پہچانتا تو بہتر۔'

بالمکند شرما جوش ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں......جو لکھا ہے......اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں......اٹھ کر بالکنی پر آ جاتے ہیں......

آسمان میں دور تک دھویں کی ایک لکیر بچھی ہوئی تھی—

(۲)

۴؍جنوری کو اکبر پورہ میں جو کچھ ہوا، اس نے شہر کی فضا پر برا اثر ڈالا۔ ایک بار پھر پوری فضا بارودی ہو گئی— کپڑوں کے تھوک بکریتا مولوی غفار کے ساتھ ہوئی بدسلوکی کا معاملہ بھی گرم تھا— اسپتال میں جس زخمی نے دم توڑ دیا، وہ عبدالرحمٰن تھا— اور مولا بخش کپڑے والے کے یہاں ملازم تھا— عبدالرحمٰن کی بیوی اور کچھ ایک رشتہ دار روتے پیٹتے ہوئے تھانہ پہنچے۔ اس وقت تک مرحوم عبدالرحمٰن کی لاش تھانے لے جائی

چکی تھی— پولیس نے کسی نامعلوم خطرے کے ڈر سے عبدالرحیم کی لاش اس کی بیوی اور عزیزوں کو سونپنے سے انکار کردیا— اس وقت تک شہر کی فضا میں خوفناک قسم کے گدھ گھومنے لگے تھے— اکبر پورہ اور پاس پڑوس کے محلے میں جہاں دہشت کے پھیلنے کا امکان تھا، کرفیو لگا دیا گیا— شام میں محلے کے چند شرفاء ایک جتھا پولیس افسر سے ملنے کے لیے تھانے آیا، تاکہ عبدالرحیم کی لاش حاصل کی جا سکے اور اسلامی طریقے کے مطابق تجہیز وتکفین کی جا سکے— لیکن معلوم ہوا کہ پولیس سارا کریا کرم تو پہلے ہی نمٹا چکی ہے۔

یہ معمولی بات تو تھی نہیں— کچھ چھوٹے موٹے لوگ اس واقعے کو مذہب کے ایمان سے جوڑ رہے تھے—

تھانہ انچارج رام درشن جوشی اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اگر ان محلے والوں کو عبدالرحیم کی لاش مل جاتی ہے تو پھر ان کے کھولنے اور ابلنے کو ایک مضبوط ہتھیار مل جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ لوگ قابو سے اس قدر باہر ہو جائیں کہ پھر انہیں سنبھالنا ہی مشکل ہو جائے— پہلے تو اس نے تھانہ کے ہوہلہ کرنے والوں کو سمجھایا لیکن ہنگامہ کرنے والے جب اپنی مانگ سے ہٹتے نظر نہیں آئے تو اس نے قانونی دفعہ کا سہارا لے کر انہیں جیل میں بند کر دینے کی دھمکی دی۔ یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی— عبدالرحیم کی بیوی بچے اور عزیز روتے ہوئے گھر واپس ہو لیے—

تھانہ انچارج جوشی کو پتہ تھا کہ مرحوم عبدلرحیم کوئی ایسا ویکتی (شخص) تو نہیں کہ زیادہ شور وغل مچ سکے— نہ ہی کوئی بااثر یا بارسوخ شخص تھا— ہاں محلے کے مسلمان زیادہ سے زیادہ چار پانچ دن یا ہفتہ بھر بھونک بھانک کر چپ رہیں گے— اور فی الحال کے لیے کرفیو تو ہے ہی— گو اب بھی ایک نامعلوم سا خطرہ بنا ہوا تھا کہ ایسے موقع پر کوئی لاوارث لاش بھی اپنا اثر دکھا جاتی ہے— اور مرحوم کو تو خیر سے دس جاننے والے تھے۔

پچھلے دنگے کی ریہرسل کے بعد اس بار پولیس کچھ زیادہ ہی چوکس تھی اور دوسرے معنوں میں بے رحم تھی— بڑے پیمانے پر ہونے والی گرفتاریوں نے بھی شہر کو آگ کے شعلوں کے سپرد کرنے سے روک رکھا تھا۔

مگر شہر واسی—

لگاتار فساد میں گھرے شہر کی جو حالت ہوتی ہے وہ ان کی تھی— عام زندگی کی رونق اگر لوٹ بھی آتی ہے تو کیا ٹھکانہ، نحوست کا کوئی باب پھر سے نہ کھل جائے؟ تباہی وبربادی کی شروعات پھر سے نہ ہو جائے—

کبھی کبھی سڑک پر کھڑکی کھول کر بالمکند سڑک کا نظارہ کر لیتے۔ یہ سناٹے تو آزادی کے بعد جیسے اس ملک کا نصیب بن گئے تھے— گہرا پراسرار سناٹا۔ اور اس سناٹے کو توڑتی، سائرن بجاتی، گزرتی کوئی پولیس جیپ— کھڑکی پر دونوں ہاتھ رکھے بالمکند دیر تک اس سناٹے کا جائزہ لیتے رہتے— انہیں لگتا کہ بہت سے لوگ ہوتے۔ اور وہ انہیں گھیرے بیٹھ جاتے...... وہ ان لوگوں کو پرانے دنوں کی داستان سناتے...... اور بے شک اس پرانی داستان سے صرف سکھ بھرے قصوں کے گٹھر کھولتے...... پھر شروع ہو جاتے...... داستان ختم...... کرتے تو بیٹھے ہوئے ان لوگوں سے دریافت کرتے...... میاں اب بتلاؤ جھوٹ کیا سچ؟ میاں سولہ آنے سچ— اور یقین نہیں آرہا تو اپنے بڑے بوڑھوں سے دریافت کرو— سب سولہ آنے سچ— اور میاں یقین آئے گا بھی تو کیسے— ایک غلامی سے نجات ملی تو اب سینکڑوں طرح کی غلامی اوڑھ رہے ہو تم لوگ...... ذہنی، روحانی، پیسے ہم بھی کھاتے تھے میاں۔ سیاست کا ہمیں بھی شوق تھا تبھی تو شطرنج کھیلتے تھے...... مہرے، پیدل، فیل، وزیر، بادشاہ، کشتی— کیسے ہوتی ہے جنگ...... کیسے مات دی جاتی ہے...... شری کرشن کی گیتا، کورو پانڈو کے قصوں سے تمہاری آج تک کی سیاست، سب کی خبر ہے مجھے۔ مگر میاں— اب جب تم اپنا ذہن بدل رہے ہو تو اس کا علاج کیا ہے— کچھ بھی نہیں ہے—

ہاں تمہاری وحشت مجھے تنہا کر دیتی ہے، اکیلا کر دیتی ہے— کس کے پاس میں جاؤں، پوچھنے کے لیے میاں تم بالمکند شرما جوش پر شک بھری نظریں دھرتے ہو تو اس کی وجہ بتلا سکتے ہو؟

اس کے دونوں بچے؟

نہیں میاں۔ باپ صرف اپنے بچوں کو پڑھا لکھا کر اپنی ذمہ داری سے مکت نہیں ہوتا—؟

بچے ایک نیا ہندستان چاہتے ہیں اور یہ ہندستان تمہارے ست رنگی تصور والے ہندستان سے جدا ہے— تم اپنے بچوں پر الزام کی بارش بھی

نہیں کر سکتے — یہ ہندستان انہوں نے ان خواب رنگوں سے تعمیر کیا ہے، جس کی زمین تم نے فراہم کی ہے — ایک خون میں ڈوبی ہوئی آزادی تم نے انہیں ورثے میں دی — یعنی آزادی تو دی مگر لہولہان — وہ ایک آزاد ملک میں پروان چڑھے، لیکن سرحدوں پر پھیلے ہوئے خون خشک ہو جانے کے بعد بھی اپنی نفرت، اپنا غبار اپنا میلان پن چھوڑ گئے۔ ادھر وقت گزرتا رہا اور یہ نفرت، یہ غبار، آزادی کی پرانی ہوتی داستان کے ساتھ ان کے احساس کا ایک جزو بنتا گیا —

میاں بالمکند — ست رنگا تصور وقت کے ساتھ دھجی دھجی ہو کر بکھرتا رہا — ایک نسل جاتی دوسری نسل آتی تو جیسے سوغات میں یہ نفرت اور غبار بھی لاتی —

اس ست رنگے تصور کے جنک کبھی تم بھی رہے ہو بالمکند اس لیے الزام سے گھبراتے کیوں ہو —

''گھبراتے کیوں ہو بالمکند شرما جوش؟''

''ہاں کیا ہو جاتا ہے مجھے؟''

وہ برکت حسین سے پوچھ رہے تھے — یہ کیسی بیماری ہے برکت حسین۔ ذہن کھلا ہوتا ہے اور خیالات گھرنی کی طرح ناچتے رہتے ہیں۔ رات میں چاہے نیند آنے کے ٹیبلیٹ کھالو مگر آنکھوں کے آگے وہی اتیت گھومتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی تھک جاتا ہوں تو جیسے سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ ڈاکٹر کہتا ہے۔ بوڑھے میاں کو بھولنے کی بیماری ہے پھر یہ اتیت؟

ڈاکٹر روگ کا علاج کر سکتا ہے برکت حسین، لیکن بڑھاپے کا؟ بڑھاپا محض روگ نہیں ہے برکت حسین، جو یہ کل کے لونڈے چھونڈے ڈاکٹر اسکا علاج کھوج سکیں۔'

''سچ کہتے ہو جوش میا۔ بڑھاپا تو اپنے ماضی کو ٹٹولنے کی یادگار ہے...... یادگار جو فنا ہونے سے پہلے ایک بار بھڑکنا چاہتی ہے — اور اسی لیے اپنے اتیت کو آواز دیتی ہے۔''

''بچے۔''

بالمکند ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں — اس ملک کا کیا ہوگا برکت حسین —!

بول کر ایک دم سے چپ ہو جاتے ہیں۔ جیسے سوچ رہے ہوں، یہ بیکار کی گپ لے کر کیوں بیٹھ گئے۔ ملک کی چنتا تو غلام دنوں میں تھیں۔ تب بھی بے فکری کے دانے چنتے تھے کہ یہ شعلے بس بجھنے کو ہی ہیں۔ فرنگی شعلوں میں تہذیب کے لبادے کا بس ایک کونہ ہی تو جھلسا ہے — اس کونے کو تو جھلسنا ہی تھا — اتنا تو ہونا ہی تھا — سوز یادہ غم نہیں تھا۔ ملک کے دامن سے ایک اور ملک نکل جائے تو......؟ تقسیم کی وحشت کچھ دنوں کا سکھ چین تو چھینتی ہی ہے۔ پھر۔ ہمیشہ کے لیے امن...... سکھ چین اور بانسری کی تان...... پھر وہی ملتے ملاتے رہئے ہولی، دیپاولی، درگا پوجا، عیدالفطر، عیدالاضحیٰ اور مشترکہ کلچر —؟

وہ ادھر ادھر ہاتھ گھماتے ہیں —

''کیا تلاش کر رہے ہو؟''

برکت حسین پوچھتے ہیں۔

''ناس۔ ناس کی شیشی۔ نہیں مل رہی۔''

''اب ناس بھی لگانے لگے؟''

''خاندانی عادت چھوٹتی کہاں۔ لگ ہی جاتی ہے۔'' مسکراتے ہیں بالمکند۔ چھوڑو کہیں رکھ دی ہوگی۔ بھلکڑ دماغ — بچے بھی سمجھتے ہیں۔ باؤجی کا دماغ ہلکا ہو گیا ہے ہلکا — مگر ہلکا ہوتے ہوتے یہ اتیت اپنے پنجے کیوں گاڑ دیتا ہے......

سوچتے سوچتے لگتا ہے...... اندھا ہو گیا ہوں۔ ہر چیز دھند میں ڈوبی۔ مدھم...... مبہم...... دھند لکے...... اور دھند لکے میں تیرتی چند

پر چھائیاں...... یہ پر چھائیاں تقاضا کرتی ہیں کہ پہچانو......

''پھر پہچانتا ہوں برکت حسین...... صاف صاف...... ہم ہیں...... تم ہو...... بچپنا ہے۔ حالی محالی ہیں— گھر ہے آنگن ہے۔ آنگن میں وہ...... یاد ہے تمہیں امرود کا پیڑ— الطاف چچا گھر آتے تو ابا سے ضرور کہتے۔ میاں رام ولاس امرود تو بس الہ آباد کے ہوتے ہیں یا تمہارے گھر کے......''

برکت حسین کے منہ میں پانی بھر آتا ہے...... واہ میاں جوش۔ کیا یاد دلا یا تم نے بھی— وہ درخت تو شاید ہمارے بچپن کے زمانے میں تھا۔ مجھے یاد ہے— عبداللہ پاسی کا لڑکا امرود کے پیڑ سے گر کر جس دن زخمی ہوا تھا......''

''ابا نے اسی دن غصے میں درخت کے قتل کا حکم سنا دیا۔ یہ فیصلے بس اسی طرح آنا فاناً ہو جاتے تھے۔ پیڑ بھی تھا خاندانی— کٹنے کو کٹ گیا۔ مگر ابا بھی جی بھر کر روئے تھے۔ کہتے تھے دادا کو بھی بے حد پسند تھے اس کے امرود— ایک اور نشانی گم ہو گئی— ہائے ایسی ایسی کئی نشانیاں گم ہو جائیں گی۔'

''اب چھوڑو بھی جوش میاں— ''برکت حسین کے چہرے پر ناخوشگوار تاثر ابھرتے ہیں—؟''پرانے دنوں میں لوٹنے سے کیا فائدہ۔''

''اتیت فائدہ نقصان کہاں دیکھتا ہے بھائی۔ مگر ٹھہرو— کیا یہ موت کی سنوائی ہے— کبھی کبھی سوچتا ہوں— حال میرے سامنے سے کھسک رہا ہے۔ خود کو بھی سامنے کے بچوں کو بھی بھول رہا ہوں۔ مگر اتیت...... صرف وہی زندہ ہے۔ بھولے بسرے چہرے، کبھی اماں بلاتی ہیں کبھی ابا دکھائی دیتے ہیں اور بھی...... وہ منگر و بھشتی، بچپن میں گودوں کھلانے والی فجیلن...... سب جیسے کسی تواریخی کردار کی طرح مجھے گھیر کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ محلے کے گزرے ہوئے دوست، یار، عزیز بزرگ...... اور— بچپن...... جوانی— جوانی میں محبت کہاں کی، سمجھوتہ کیا تھا—

بہت کچھ سوچتا ہوں۔ یہ بھی...... کہ میں جا رہا ہوں۔ اور میرا کوئی وارث نہیں ہے— جو میری میراث، میری وراثت سنبھالتا— جو مجھ سے جڑی روایتیں میرے بعد بھی جاری رکھتا— میرے بعد کوئی نہیں ہے۔ یہ حق بات مجھے کھائے جا رہی ہے......

''بالمکند کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتے ہیں—''

''ایک تو بوڑھاپا اور اس پر تھکنے کا عمل۔ تم تھک گئے ہو جوش میاں— بڑھاپے میں کیسے کیسے دور، کیسے کیسے مرحلے آتے ہیں—''

''یہ ملک......'' ٹھہر کر ہنسنے لگتے ہیں...... گھوم پھر کر کہیں سے چلو، واپس بس اسی مرکز پر آ کر ٹھہرنا پڑ جاتا ہے...... کبھی کبھی خود پر غصہ آتا ہے کیوں سوچتا ہوں یہ سب۔ بچے ٹھیک کہتے ہیں۔ رام رام کرنا چاہئے مجھے۔ پوجا پاٹھ۔ ہر پر کار کے سوچ سے سنیاس لے لینا چاہئے۔ مگر— ممکن ہے برکت حسین، بچے ٹھیک ہوں۔ مگر حقیقت پسند ہوں نا؟ لگتا ہے روایت سے کاٹے جانے کا مطلب ہے کچھ ختم ہوا ہے۔ کچھ بربریت سے ختم کیا گیا ہے۔ اور اس ختم کیے جانے کے عمل میں برسوں لگے ہوں...... کبھی لگتا ہے میرا قتل کیا جا چکا ہے—''

''اور تمہارا قتل تمہارے بچوں نے کیا ہے؟ اس لیے کہ وہ تمہاری روایت کو آگے نہیں بڑھا سکے—''

''نہیں برکت حسین۔ سچ کا ایک رخ یہ بھی ہے— مگر میں کیا چاہتا ہوں۔ یہ...... کہ وہ مشاعرہ باز ہو جاتے۔ وہ اردو سیکھتے، پڑھتے...... روایت ڈھوئے جانے کی چیز تو نہیں ہوتی۔ میرا چاہنا۔ اتنا محدود نہیں ہے برکت حسین۔''

مجھے صرف اس روز روز بڑھتی ہوئی آگ سے خطرہ ہے۔ اس لیے لگتا ہے، بچے ہماری راہ پر چل رہے ہوتے تو...... یہ کھیم پورہ، اکبر پورہ...... یہ آگ گلی گلی اور محلے محلے میں نہیں پھیل رہی ہوتی...... مگر قصوروار اکیلے کیا صرف میرے بچے ہیں؟ اب لگتا ہے سب نے اپنی اپنی الگ الگ دنیائیں بنا رکھی ہیں۔ اور الگ الگ دنیا کے تصور بھی الگ الگ ہیں۔ ظاہر ہے برکت حسین دو چار برتن ہوں گے ڈھن ڈھنائیں گے ہی...... بس وہ لڑ رہے ہیں۔ لڑے جا رہے ہیں—''

برکت حسین نے پن ڈبہ کھولا۔ پان نکالا۔ منہ میں دابا— اور ٹھنڈی سانس بھری—

''میں کچھ کہنے آیا تھا جوش میاں—''

''ہاں— بات کیا ہے—؟''

''وہ......اپنا منا— تحسین حسین۔''

''کہو۔کہو......''

ٹھیک اسی وقت دالان خانے کے دروازے سے نریندر کا چہرہ طلوع ہوا—

''آداب چچا جان......''

''جیتے ......رہو......بیٹے......'' برکت حسین کے لہجے میں تھرتھراہٹ دوڑ گئی۔

''بات کیا ہے برکت حسین؟''

بالمکند جوش کی آنکھوں میں فکر کے ڈورے تیر گئے—

''منا۔کچھ خبطی سا ہو گیا ہے۔نریندر بیٹا— وہ کچھ غلط طرح کے لوگوں کے ہاتھوں میں تو نہیں چلا گیا ہے؟''

نریندر کے چہرے پر ایک تناؤ سا پیدا ہوا—

یہ تناؤ اس سے قبل بالمکند یا برکت حسین نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔نریندر میز کے پاس والی اونچی کرسی پر بیٹھ گیا—

''کیوں خطرہ لگتا ہے آپ کو؟''

برکت حسین بغلیں جھانکنے لگے—

نریندر کی آواز میں سختی تھی— ''سب بکواس ہے— آپ لوگ دراصل ڈر گئے ہیں— اس ڈر کو نکالیے گا نہیں چچا جان تو پریشان کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا—''

اور ایک بوڑھی آواز جیسے ایکدم سے لرز اٹھی—

''نریندر بیٹا میں بڑے چھوٹے سوال جواب نہیں جاننا چاہتا بیٹے۔صرف یہ کہ......میرا منا واپس کر دو— میرا اکلوتا منا—''

برکت حسین کی آنکھوں سے آنسو ایک موٹا قطرہ ٹپکا اور بالمکند کے سینے میں آگ ہی آگ لگ گئی۔

''یہ کیا پاگل پن ہے چچا......آپ تو ایسے گھبرا رہے ہیں جیسے......'' نریندر کی آواز اور سخت ہو گئی— وہ جانے کو مڑا—

''جبکہ سچائی یہ ہے کہ آپ کو بھی غور کرنا چاہئے۔ یہ طے ہے کہ اب ہماری پارٹی آئے گی اور آپ کے لیے بھی ضروری ہے کہ آپ اس کے لیے کچھ Soft Corner پیدا کر دیں— اگر چاہتے ہیں کہ مسلمان یہاں امن سے رہیں— بات کڑوی ہے لیکن سوچئے گا۔''

پھر نریندر رکا نہیں۔تیزی سے آگے بڑھ گیا—

برکت حسین نے آنسو پونچھے—

''جوش صاحب پتھریلی ہنسی ہنسے......چلو مطلع صاف ہو گیا— اس مطلع کا صاف ہونا بھی ضروری تھا۔کیوں برکت حسین۔''

لیکن برکت حسین تو کسی اور ہی دنیا میں گم ہو گئے تھے—

●●

۴رجنوری کو اکبر پورہ میں ہونے والے فساد کی دوسرے ریہرسل کی چنگاری بھی پھس پھس ثابت ہوئی تو امر جیت اور ڈاکٹر نوید وغیرہ کا چونکنا واجب تھا— انتظامیہ کی سختی نے اس باران کا وار خالی کر دیا تھا— بہر کیف، اب چاروں طرف دلی میں ہونے والی ریلی کے تذکرے تھے— جس کو بڑے پیمانے پر کامیاب کرنے کے لیے یہاں سے ہزاروں کی تعداد میں کاریہ کرتاؤں کو لے جانا تھا— نیل کنٹھ، نریندر، سدھیند ورائے گاؤں گاؤں گھوم کر مزدوروں، کسانوں اور غریبوں کو دلی گھومنے کی مفت دعوت دیتے پھر رہے تھے—

''ارے کرنا کیا ہے۔شان سے دلی جاؤ۔گھومو پھرو اور چلے آؤ— سب کچھ مفت—''

مسلم کاریہ کارتا بھی شامل ہوتے، اس خیال کے تحت منا سے بات چیت بھی کی گئی لیکن منا نے بے فرصتی کا بہانہ بنا کر اپنے انکار کا پہلا نمونہ

پیش کر دیا۔منا کے سیدھے انکار سے پارٹی کاریالیہ میں خاصا اتھل پتھل مچی تھی۔ڈاکٹر نویندو خاص کر بہت غصہ میں تھے—

''یہ سالے بیچ میں ہی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں— دنگوں میں زمین پر لاوارث مر رہا تھا— وہ تو سدھیند ورحم کھا کر لائے۔ہم نے بھی پناہ دی۔ مفت علاج کیا اور جب ہماری یاد آئی تو کنی کٹا رہا ہے—''

ڈاکٹر نویندو کا پارہ اتنا گرم تھا کہ ابھی اگر منا کا بچہ ہاتھ لگ گیا تو وہ اس کا صفایا ہی کر دیں گے— وہ کچھ سوچ کر نیل کنٹھ سے بولے۔

''ذرا ریلی نکل جائے۔پھر کچھ سوچتے ہیں منا کے بارے میں۔گھبرانا مت نیل کنٹھ''۔

لیکن کیا سوچتے۔منا کی تو ادھر روٹین ہی خراب ہوگئی تھی وہ بھاگتا پھرتا تھا۔شکل چھپائے پھرتا تھا۔مگر کس سے—؟ جتنی دیر دفتر میں ہوتا، اتنی دیر ہر پل اس کا کلیجہ کسی انہونی کے خیال سے دہل رہا تھا۔کب کیا خبر آجائے— کوئی پارٹی کا آدمی آجائے۔گولی مار دے—

'گولی مار دے......' سچ تو یہ ہے کہ وہ اس سے بھی آگے سوچنے لگا تھا— مگر کیوں سوچنے لگا تھا— اتنا ڈر، اتنا خوف...... کہ اب وہ نوکری چھوڑ کر چھوٹی موٹی تجارت کو اولیت دینے لگا تھا۔ایک بار رات میں گھر لوٹ کر اس نے ابا سے باہر دبئی وغیرہ جانے کی بات تو برکت حسین چونک گئے تھے۔مگر منا کے اندر بیٹھے ڈر کی تہہ تک نہیں جا سکے۔اس تہہ تک جانا آسان بھی نہیں تھا۔اس ڈر کو صرف منا ہی دیکھ رہا تھا—

کہیں بھاگ جائے۔باہر چلا جائے۔تجارت کر لے۔نہیں تو۔پستول کی گولی تو ہے ہی، اسے ختم کرنے کے لیے—

سچ تو یہ ہے کہ وہ پوری زندگی میں اتنا خوفزدہ کبھی نہیں ہوا تھا۔آفس آور ہو جاتا۔تب بھی ادھر ادھر اپنے مسلمان دوستوں کے یہاں بے وجہ چلا جاتا— وہ برکت حسین کا لڑکا ضرور تھا۔لیکن آزادی کے بعد جس ماحول میں اس نے آنکھیں کھولیں تھیں وہ ماحول چار خانے والی لنگی پہننے والے اور وہ بھی موڑ کر پہننے والے مسلمانوں سے جدا نہیں تھا۔جو ہاتھ میں روزانہ یا مفت روزہ بھڑکاؤ اردو اخبار کی کاپی کھولے زور زور سے کسی کمانی کے چائے کی دکان یا عبدل پان والے کی دکان پر بیٹھک لگائے سنسنی پھیلا رہے ہوتے ارے سنا امریکہ سعودی عرب پر بم گرانے والا ہے— صدام پھر حملے کی یوجنا بنا رہے ہیں......تاج محل میں اب پوجا بھی شروع ہو چکی ہے— اب تک متھرا، کاشی اور اجودھیا ہی تھا۔اب یہ تاج محل بھی گیا ہاتھ سے......

جتنا سا ذہن، اتنی سی باتیں......مگر منا اب خوف کے سائے میں پل رہا تھا۔سڑک پر کوئی راہگیر گھورتا ہوا ملتا تو وہ ڈر جاتا۔آفس میں اس کے نام کی کوئی کال ہوتی تو وہ ڈر جاتا— پوری شام کاٹ کر رات کے دس ساڑھے دس بجے تک وہ چھپتا چھپاتا گھر میں داخل ہوتا۔دروازہ کھلنے پر بھی ڈرا ہوتا کہ کہیں، ابا یہ نہ کہہ دیں کہ کوئی کھوجنے والا آیا تھا۔یا کوئی بری خبر؟

●●

امرجیت نے کہا— 'منا کے بارے میں بعد میں سوچیں گے۔ابھی ریلی کو سپھل (کامیاب) بنانے کے بارے میں سوچنا ہے—'

'نیل کنٹھ نے سگریٹ کی راکھ جھاڑی— لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑیگا منا کا؟'

سدھیند ورائے پھیکی ہنسی ہنسے، ابھی کافی سمے ہیں نریندر، چنتا چھوڑو—

''چنتا منا سے ہے— وہ بہت کچھ جان گیا ہے ہمارے بارے میں؟''

امرجیت کو غصہ آگیا۔'کیا جان گیا ہے۔تم تو ایسی باتیں کر رہے ہو جیسے یہ کوئی راشٹریہ پارٹی نہ ہو کر فاسسٹوں کی جماعت ہو— ارے تم لوگ ہی غلط پروپیگنڈہ کرو گے تو پھر دوسرے کیسے آئیں گے۔ہم تو ایک سیدھانتک لڑائی لڑ رہے ہیں۔ہمارا کہنا یہ ہے کہ اب تک الپ سنکھیوں (اقلیتوں) کی ساری مانگیں سنی اور مانی جاتی رہی ہے۔اور بہوسنکھیوں (اکثریت) کی کوئی سنوائی نہیں— بس اتنی سی بات ہے سیدھانتک لڑائی — نریندر۔تم لوگ جوانی کے بہاؤ میں اسے غلط رنگ دے رہے ہو، اس سے پارٹی کو ہی دھکا پہنچے گا—''

نریندر چپ ہو گیا—

''امرجیت سوچتے رہے۔پھر بولے— منا کا انتظام اوش (ضرور) ہوگا۔پر ابھی نہیں— ابھی ڈاکٹر نویندو کی چنتا کرنی ہے۔ڈاکٹر نے جتنے آدمیوں کو لے جانے کا Target رکھا ہے، وہ کیسے پورا ہوگا—''

''وہ پورا ہوگا نا، سر''
نریندر ایک دوسرا سگریٹ سلگایا۔
سدھیند ورائے نے یاد دلایا— ''کل لوکل لوگوں نے اسی مدے پر ڈیبیٹ رکھا ہے۔ آپ چلیں گے امر جیت؟''
امر جیت نے منع کر دیا۔ نہیں تم لوگ جاؤ— مجھے اور ڈاکٹر نویندو کو کچھ کام بھی دیکھنے ہیں—

●●

''ڈیبیٹ، بحث ومباحثے، مذاکرے—''
فیض سقراطی ہنسا— ''ہم پڑھے لکھے لوگوں کا اب بس یہی کام رہ گیا ہے—''
''چلو کوئی تو کام ہے۔ ورنہ ہم نے تو اپنے آپ کو بیکار کی فہرست میں شمار کر لیا تھا۔'
نازاں خیال نے ہنستے ہوئے کہا—

یہ کمیونیٹی سینٹر کا چھوٹا سا ہال تھا۔ جہاں سو سے دو سو کے بیچ آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ ہال کے دائیں بازو کی طرف ایک چھوٹی سی پھلواری تھی— کھلے دروازے سے، چلتی ہوئی ٹھنڈی ہوا اپنے ساتھ خوشبوؤں کی سوغات بھی لاتی— چھوٹے شہروں میں اس طرح کے ڈیبیٹ کی خاصی اہمیت ہوتی ہے۔ پڑھا لکھا حلقہ، کالج کے اسٹوڈنٹس، ٹیچرس، پروفیسرز، انٹلکچولس، ادیب، ساہتیہ کار، رنگ کرمی، اپنے اپنے خیالات کی پٹاری لے کر حاضر ہو جاتے— یہ دراصل کھلا منچ ہوتا، جہاں سے اپنی بات کے اظہار کا سب کو موقع ملتا— لوگ آرام اور سکون سے سب کو سنتے— پھر ایک ایک کر کے تبصرے ہوتے— درمیان چائے کا وقفہ تھا— بہت بہت، اس طرح کے نشستوں کا وقفہ دو چار گھنٹوں کا ہوتا۔
کمیونیٹی سینٹر کے، اس رویندر بھون میں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ دری پر سب کے انتظام بھی تھا— کنارے مائک لگا ہوا تھا۔ یعنی جسکا نام پکارا جاتا وہی کھڑا ہو کر اپنے خیال کا اظہار کرتا—
ابھی ڈیبیٹ شروع نہیں ہوا تھا— پانچوں اس وقت ہال کے باہر ہی کھڑے تھے بات چیت کا رخ ماحول سے اٹھ کر ان کی محبوباؤں کی طرف بھی آیا۔ لیکن محبوباؤں کے نام پر ان کے اندر کوئی جوش وخروش نہیں تھا— ایک طرح کی اداسی سب میں سمٹی ہوئی تھی—
''مارو گولی حنا کو۔ فیض سقراطی کا لہجہ عجیب تھا— اب تو ایک ہی محبوبہ ہے اپنی۔ نوکری۔'
'' یار۔ اب لگتا ہے، اس ادب کے پھیرے میں ہم اپنا وقت ضائع کرتے رہے ہیں— کچھ کام ہی سیکھ لیتے تو ضرورت بلا ضرورت کام ہی آ جاتا۔''
'کم از کم کتابت ہی سیکھ لیتے۔'
نازاں خیال کی پھسپھسی ہنسی پر کسی کو ہنسی نہیں آئی—
''نوکری!''
اندر بھنبھناہٹ تھی اور باہر، ان پانچوں کے بیچ کسی خیالی جل پری کی طرح اٹھکر نوکری آ گئی تھی—
''مل جائے تو لپک لو—''
'پکڑ لو۔ تھام لو۔ بھاگنے نہ پائے۔''
''کہاں ہے یار؟''
''وہ ہے......''
اس بار پانچوں ہنسے—
'احمد ربانی بولا۔ چھوڑو چلتے ہیں۔ کیا رکھا ہے اس مندر مسجد میں۔'

اس نے پیٹ پر ہاتھ مارا۔ یہ روٹی کھوجتا ہے۔اور روٹی نوکری۔مسئلہ صرف ایک ہے۔حکومت نے اس سے بچنے کے لئے عام آدمی کو مندر مسجد میں الجھا دیا ہے۔،

''کوشش کر کے دیکھ لی۔سالے بوڑھے ہو جائیں گے۔شادی بھی نہیں ہوگی۔'' نازاں خیال طنز سے مسکرایا— ''مندر مسجد کرتے جاؤ۔ پیٹ کا حال سنے نہ کبیرا— نوکری گئی بھاڑ میں، روتا جائے بنجارہ—''

''ہوش کی دوا کرو خیال صاحب، فیض سقراطی نے ڈانٹا۔نوکری ظالم ایسی بے وفا محبوبہ ہے جس پر شاعری نہیں ہونی چاہئے—''

باقر مرزا نے ریڈیو پر کمنٹری کرنے والے انداز میں کہا— ''بھائیو۔ہم اس آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں۔نوکری تو غلامی کی چیز ہے۔نوکری غلام کرتے ہیں۔ہمیں یہ سوچ کر خوش ہونا چاہئے کہ آزاد ملک کے آزاد شہری کی بھومیکا ہم سے زیادہ ایمانداری سے کوئی نہیں نبھا رہا ہے اس لیے کہ ہم آزاد ہیں اور نوکری نہیں کر رہے— ہم حکومت پر کوئی بوجھ نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں کوئی ٹیکس بقایا نہیں ہے— ہم گریچویٹی اور پی ایف کے بارے میں کچھ نہیں جانتے—''

''آزاد ملک کے آزاد شہر۔ ہاہہ......'' فیض سقراطی ہنسا—

اندر سے کوئی بے سرے سر میں اعلان کر رہا تھا۔ جو صاحب باہر ہوں، اندر چلے آئیں۔ ہال میں بیٹھیں۔

''اندر چلنا چاہئے—''

فیض سقراطی نے کہا—

ٹھیک اسی وقت تیر کی تحسین حسین نے کمیونیٹی سینٹر کے دروازے پر قدم رکھا۔اوران کے پاس سے گزر گیا۔

''پہچانتے ہو؟'' باقر مرزا نے کہا—

''نہیں—''

''بھاجپا کا ممبر ہے۔،

''اچھا—''

اور سنو۔ چودھری برکت حسین کا لاڈلا ہے— تحسین حسین۔مسلمان ہے'' — مسلمان ہے اور بھاجپا......''

نازاں خیال کرتے ٹھہر گیا۔اسے اپنی آواز خود ہی اٹکتی ہوئی لگی۔

فیض سقراطی نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔''کامریڈ۔آ گئے نا اسلام پر۔''

''نہیں۔میرے کہنے کا مطلب تھا......اور ہم اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔'' باقر مرزا نے اشارہ کیا۔چلو اندر چلتے ہیں—

●●

اندر کاروائی شروع ہو چکی تھی—

سورج غروب ہو چکا تھا۔شام کے سائے چاروں طرف پھیل گئے تھے۔

پانچوں نے اپنی جگہ لے لی

—باہر ہوا تیز تھی— کمرے میں 'رات کی رانی' اور چمیلی کے پھولوں کی خوشبو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اندر داخل ہو رہی تھی۔

پانچوں ٹھہر گئے— مائیک کسی جوشیلے مسلمان نے تھام رکھا تھا۔ جوز ور زور سے ہاتھ بھانجتا کہہ رہا تھا۔

''بھائیو!—''

●●

منا کے بدن میں حرکت ہو رہی تھی۔اس کے اندر کا آدمی بار بار اٹھ کر مائیک پر آنا چاہ رہا تھا۔مگر—

بیٹھے ہوئے لوگوں میں سدھیند وا ور نیل کنٹھ بھی تھے۔ایک بار منا کی ان دونوں سے نظر بھی ملی۔سدھیند ورائے نے کچھ اشارہ بھی کیا مگر منا

پتھر کی مورت بنا رہا۔ نیل کنٹھ اسے دیکھ کر مسکرایا بھی۔ اشاروں میں سدھیند ورائے سے پوچھا—

''یہ پاگل یہاں کیسے آ گیا؟''

''پتہ نہیں—''

سدھیند ورائے چھوٹے سے ٹھونگے میں رکھا گیا چنا پھانکنے لگے— ''تو تم بھی کھاؤ—''

نازاں خیال نے دھیرے سے باقر مرزا کو ٹہوکا لگایا۔ ''میں جاؤں کچھ بولنے کے لئے۔''

''اماں سنو میاں—'' باقر مرزا نے منہ بنایا—

فیض سقراطی نے لقمہ دیا— ''مائیک پر جاؤ گے اور نوکری کی بات چھیڑو گے، بیٹھ جا یار— سننے دے—''

مائیک لوکل اردو ڈیلی کے ایک صحافی نے تھام لیا تھا— جس کی گھن گرج فضا میں گونج رہی تھی۔

نیل کنٹھ نے منا کو پھر اشارہ کیا۔

''آ جاؤ تم بھی برخوردار— کب سے منہ پھلائے بیٹھے ہو۔،،

منا تن گیا—

سدھیند ورائے مسکرائے۔ ''چھوڑو بھی کیوں تنگ کرتے ہو۔،،

''یہ لوگ ......'' منا کو مائیک پر بولتے ہوئے سارے لوگ جھوٹے لگ رہے تھے۔ شاید وہ اسی لئے یہاں پہنچا تھا— اپنی بات کہنے۔ مگر کمزوریاں اسے گھیر رہی تھیں۔ ہفتوں سے، لوگوں میں چھپنے چھپانے والے منا کو اس نے مضبوطی بھری تسلی دی تھی...... مرنا ہی ہے تو ایک بار مر جاؤ— مگر اپنی بات تو کہہ جاؤ۔ ان موقع پرستوں اور مصلحت پسندوں سے زیادہ سچی اور کھری بات تمہاری ہوگی تحسین حسین تو تمہاری باتیں ان لوگوں تک کیوں نہیں پہنچیں— پہنچتی ہیں۔ مسلم رہنماؤں کی باتیں، بدھی جیویوں کی، پڑھے لکھوں کی— ایک سوچ تو تمہاری بھی ہے۔

اس نے نیل کنٹھ اور سدھیند ورائے کی طرف پھر مڑ کر دیکھا جو اب دھیرے دھیرے خود سے باتیں کر رہے تھے۔

''موقع پرست، مصلحت پسند!''

منا کو غصہ آ رہا تھا— ''سالے، سب بھڑوے ہیں۔ کام کی بات کوئی بھی نہیں کر رہا۔ سب صرف کام چلاؤ باتیں کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو خوش کرنے والی— نہیں۔ اس سے کام نہیں چلے گا—''

اب مائیک ایک بوڑھے آدمی سنبھالا تھا۔ جو سنبھل سنبھل کر اتیت کے پنو کو ہوا دے رہے تھے۔ میل ملاپ کی کہانیاں— دوستی بھائی پارگی کی کہانیاں— محبت کی کہانیاں۔

''ان سب سے کیا فائدہ ہے اب۔،، منا کو غصہ آ رہا تھا۔ سب بیکار کی باتیں۔ لچر، کوئی فائدہ نہیں ہے— اب لڑائیاں چھڑتی ہیں تو یہ گھروں میں بند ہو جاتے ہیں۔ بزدل، باہر آ کر لچھے دار تقریروں کے لئے چھوڑ دو ان کو، پھر دیکھو۔

دمصلحت پسند سب مصلحت پسند......''

مائیک کچھ دیر کے لئے خالی ہوا، اس سے پہلے کہ کوئی اعلان ہوتا یا کسی کو بلایا جاتا، تیزی سے منا مائیک کی طرف لپکا۔ اس کی سانس چل رہی تھی۔ چہرا جذبات سے لال ہو رہا تھا۔

''سب جھوٹ۔ جھوٹ ہے سب......''

جذبات کی آمیزش سے اس کے لفظ لڑکھڑا گئے۔

سدھیند ورائے چونک گئے—
نیل کنٹھ نے چونک کر دیکھا—
منا ہکا بکا بیٹھے ہوئے لوگوں کی اس چھوٹی سی جماعت کو تک رہا تھا۔ کسی نے درمیان میں سے کہا—
''میاں، تب سچ کیا ہے؟''
''بولتے کیوں نہیں۔''
''ارے یہ کیا بولے گا۔''
''ہاں ہاں بولو۔ چپ کیوں ہو گئے۔''
منا نے گہری سانس کھینچی— جذبات لفظ بہالے گئے۔ ذہن میں صرف دھماکے ہو رہے تھے۔ جو بولنا تھا، سب دھماکوں ٹوٹ پھوٹ گیا۔
''ارے بولو میاں۔ سب کو بولنے کا حق ہے۔''
ایک بوڑھے نے اونچی آواز میں کہا۔
منا لہراتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا۔
لوگوں نے پلٹ کر دیکھا— منا نے مائیک چھوڑ دیا۔ ہٹ گیا۔ اور تیزی سے باہر نکل گیا—
نیل کنٹھ نے طنز سے سدھیند رائے کو دیکھا۔
سدھیند رائے نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا— منا نے باہر نکل کر رکشہ کیا۔ گھر کا پتہ بتایا اور بوجھل سا رکشہ پر بیٹھ گیا۔

●●

منا کا دل رونے رونے کو کر رہا تھا۔ وہ کمرے میں بجلی کی طرح گھسا اور کمرہ بند کر لیا—
شمیم نے دروازہ پر دستک دی۔
''چائے نہیں پیئے گا؟''
''نہیں۔''
منا بستر پر بیٹھ گیا۔ دماغ اب بھی سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ کچھ بول کیوں نہیں پایا۔ اگر نہیں بولنا تھا تو پھر اپنا مذاق بنانے وہ وہاں گیا ہی کیوں۔ نہیں وہ بولنا تو چاہتا تھا مگر وقت پر سب بھول گیا—
شاید ایسا ہی ہوتا ہے...... ایسا ہی ہوتا ہے— اس لئے ہماری باتیں لوگوں تک نہیں پہنچتیں۔
اس کا دل رونے رونے کو کر رہا تھا— اور سچ مچ تکیہ کو چہرے سے سٹا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

●●

''وہ اب ہمارے لئے خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔''
سدھیند ورائے امرجیت سے پھسپھسا کر بولے—
''کچھ جلدی ہی سوچنا ہوگا—''
''ریلی میں جانے کے لئے کتنے لوگوں کا انتظام ہوا۔''
امرجیت نے گہری نظروں سے سدھیند ورائے کو دیکھا— پھر بڑبڑائے۔
''ٹھیک کہتے ہو— کچھ نہ کچھ انتظام کرنا ہوگا— جیسے بھی ہو، اس بار ڈاکٹر نریندر کو ہر حال میں جتانا ہے—''
''ایک بات پوچھوں—؟''
''اَوَش (ضرور)۔''

''آپ کیوں کھڑے ہو جاتے؟''

امرجیت مسکرائے— ''کچھ لوگ پردے کے پیچھے ہی اچھے لگتے ہیں۔نریندر پیسے والا بھی ہے۔ابھی پیسے والوں کی بہت ضرورت ہے۔''

وہ پھر چنتا میں ڈوب گئے—

●●

پانچوں چپ چاپ ہوٹل میں آ کر اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ڈبیٹ سے لوٹنے کے بعد ان کے چہرے پر سستی چھا گئی تھی۔

''وہ کیا بولنا چاہتا تھا؟''

''پتہ نہیں۔''

پھر بولا۔کیوں نہیں۔

''یہی تو تعجب ہے۔''

''مجھے تو معاملہ کچھ گڑ بڑ لگتا ہے۔''

''اس کا چہرہ نہیں دیکھا— کیسا لال ہو رہا تھا۔''

''مگر وہ کہنا کیا چاہتا تھا—''

نازاں خیال نے باقر مرزا کو ٹوکا۔'تم نے کہا تھا کہ وہ......''

''ہاں۔اسی لئے تو اور تشویش کی بات ہے۔''

''کیوں نہ اس سے ملا جائے۔''

''کون سا تیر مار لوگے—؟''

''یار۔یہ تو پتہ چل جائے گا کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتا تھا۔''

نازاں خیال نے کہا— ''بڑی بات یہ ہے کہ وہ کہنا تو چاہتا تھا مگر کہہ نہیں پایا۔ہماری طرح۔یہی بڑی بات ہے۔''

''یعنی؟''

فیض سقراطی چونک گیا—

نازاں خیال نے برا سا منہ بنایا—اور یہاں کہہ کر کرتا بھی کیا۔کون سا،یہاں پارلیامنٹ بیٹھی ہے کہ سنوائی ہوگی—،

''پارلیامنٹ میں سنوائی کب ہوتی ہے یار۔وہاں تو اور بھی مچھری بازار ہے۔''احمد ربانی جھنجھلا کر بولا۔

نازاں خیال سنجیدہ ہو گیا۔'چلو چھوڑ دو۔سمجھ لو وہ ہم میں سے ایک ہے اور ہماری باتیں دل کی دل میں رہ جاتی ہیں۔یا بہت بہت ہم پانچ سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔،

پانچوں زور زور سے ہنسے۔

بیرنے پاس آ کر پوچھا— ''چائے لاؤں۔''

پانچوں نے اپنی اپنی جیبیں ٹٹولیں۔پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا دیئے— نہیں۔آج نہیں—'

میز سے اٹھ کر وہ باہر آ گئے۔

کافی دیر تک ان کی آپس میں کوئی بات نہیں ہوئی۔

مالو بیمار ہے

بالمکند کمزور ہو گئے ہیں۔جسم میں اب وہ بات نہیں رہی۔ بچے ان کی شاندار صحت کو دیکھتے ہوئے پرانے زمانے کی جس اصلی گھی کی دہائیاں دیتے تھے۔وہ گھی جسم سے اچانک ہی پگھلنے لگا تھا۔اب کمزور اتنے ہو گئے ہیں کہ بہت مشکل سے سیڑھیاں چڑھتے اترتے ہیں۔ بہت بہت یہی ہوتا ہے کہ دروازے سے باہر نکل صبح سیر کے لئے دس بارہ قدم چل پڑتے ہیں— پھر وہی الٹے پلٹے خیالات ہوتے ہیں اور بالمکند شرما جوش ہوتے ہیں......

ذراسی نیند جھپکی نہیں کہ یادوں کا حملہ شروع ہو جاتا۔پرانے پرانے لوگ جانے کب کے مرکھپ گئے۔سدرشن بابو، جمن چاچا، بدری پرساد نوکوٹھی والے۔رائے بہادر...... پھر اماں اور ابا کو دیکھتے ہیں......مبہم، دھندلے چہرے، آنکھوں میں جہاں کا نور سمیٹے آنکھوں کے پردے پر جگہ گھیر لیتے ہیں۔

''ہم یاد آتے ہیں بیٹے۔اب دیر کا ہے کی۔ہم سب بے صبری سے تمہاری راہ تک رہے ہیں—''

''کب آرہے ہو......؟''

''ابھی بہت سے کام پڑے ہیں۔اور وہ بیان......''

''کام تو چلتے ہی رہتے ہیں—بس اب آجاؤ۔''

دیکھو ہم آرہے ہیں— نیند بس موت کا فاصلہ ایک جست میں طے کرنے والی ہے......

بس یہ فاصلہ طے ہوا اور......

موت کا ایک دن معین ہے

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آنکھیں کھل جاتی ہیں تو خوابوں کی بے چینی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ہاں بچے ڈر جاتے ہیں۔

''ایسے کیوں مسکرا دیکھتے ہیں؟''

خواب میں اماں ابا کے دیدار ہوئے؟''

وہ ٹھہرتے ہیں— میرا وقت آگیا ہے— سب مجھے آوازیں دے رہے ہیں— پرانے لوگ— پرانے عزیز......کتنوں کے چہرے بھول چکا تھا......سب دھندلے دھندلے سے آنکھوں کے آگے اتر رہے ہیں۔

سرائے والی زمین کو لیکر گھر میں مقدمے بازی ہوئی تھی۔رام ولاس شرما ان دنوں کتنے بے چین رہا کرتے تھے— الطاف حسین رام ولاس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہیں...... جاؤ بھائی کو سمجھاؤ۔سب ٹھیک ہو جائے گا—

کتنے ہی ایسے واقعات آنکھوں کے آگے جگہ گھیرتے ہیں— جیسے کوئی پرانی فلم چل رہی ہو......ایک کے بعد دوسرا سین—

طبیعت ذرا ٹھیک ہوتی تو خاندانی وکیل لچھو بابو مزاج پرسی کے لئے چلے آئے۔ پہلے تو دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔پھر لچھو بابو اپنی منشا پر آ گئے۔

''اب طبیعت کیسی ہے بالمکند بابو۔''

''رب کا فضل۔''

''طبیعت ٹھیک ہو تو ذرا بچوں کے بارے میں بھی سوچئے گا—''انہوں نے لچھو بابو غور سے دیکھا—

''آپ بچوں کی کوئی سفارش لائے ہیں۔''

''لچھو بابوایک دم سے چونک گئے۔''

''یہ کیسی بات کرنے لگے بالمکند بابو۔''

''بس یونہی — مجھے لگا، میرے بچوں نے کچھ کہا ہے آپ کو۔''

''بچے کیا کہیں گے۔ مگر سوچنا تو چاہئے آپ کو—''

لچھو بابو مسکراتے ہیں— ''اور اگر بچوں نے کہا بھی تو کون سا غلط کہا۔ ان کی گھر گرہستی ہے۔ ذمہ داریاں ہیں۔ بچے ہیں۔''

بالمکند کو غصہ آ گیا۔ 'پھر صاف کہتے کیوں نہیں کہ بچوں نے بھیجا ہے۔'

''ایسا سمجھ لو— مشورہ دینا میرا کام— میں اپنی اتنی لمبی زندگی میں ایسے کتنے ہی گھروں کی خانہ جنگی دیکھی ہے۔ جہاں باپ بناوصیت کئے مر گیا اور بھائیوں میں خون خرابے کی نوبت آ گئی— چیزیں مہنگی ہیں— گھر گرہستی مشکل بات ہے۔ آپ چاہو تو دونوں کی مرضی لے لو— میں آمنے سامنے بٹھا کر وصیت کے کاغذات بنالیتا ہوں— کیوں، ٹھیک ہے نا، بالمکند بابو؟''

''نہیں—'' بالمکند کے چہرے کا مانس کھچ گیا— ''میں نے بھی سوچ لیا ہے، وصیت نہیں کرنی ہے مجھے— چاہے یہ گھر رہے یا ٹوٹے —اب بچے مل کر نہیں رہ سکتے تو اس گھر کا جو چاہے حشر ہو، کرلیں ان کی مرضی—''

لچھو بابو نے بُرا سا منہ بنایا—

''میں تو بچوں کی بات تک پہنچادی۔ تو چلوں بالمکند بابو—''

''نہیں۔ ٹھہرئے۔ برا مت مانئے— آپ تو خاندانی آدمی ہیں ہمارے— بچے چاہتے ہیں گھر کا بٹوارہ۔ اس گھر کا— آپ دیکھ رہے ہیں ۔ چپے چپے پر بزرگوں کی نشانیاں تیر رہی ہیں۔ اپنی زندگی میں، اپنی آنکھوں کے سامنے کیا کر سکتا ہوں میں— لیکن جانتا ہوں، اِدھر آنکھیں بند ہوئیں اور اُدھر بچے اپنی من مانی پر اتر آئیں گے— اتر آئیں— کون سا میں زندہ رہونگا، وہ برا وقت دیکھنے کو— لیکن جب تک زندہ ہوں میاں...... میں بھی کم ضدی نہیں ہوں''

''ارے شبھ شبھ بولئے بالمکند بابو۔''

''بچوں کے لچھن ٹھیک نہیں تو یہ گھر ٹوٹنے سے کوئی نہیں بچا پائے گا۔ یہاں اس حقیقت کو پہچانتا ہوں میں۔ اور کم از کم اپنی زندگی میں اُسے ٹوٹا اور بنا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں، بچے میرے اس زخم کو کیا سمجھیں گے—''

''نئے زمانے کے بچے!''

لچھو بابو مسکرائے— ''چلئے کوئی بات نہیں— اچھا نمستے۔ پھر اگر کبھی میری ضرورت ہو تو بلوا لیجئے گا بالمکند بابو—''

اُسی شام—

طبیعت ذرا ٹھیک تھی۔ وہ بستر پر لیٹے تھے کہ پہلے نریندر پھر انیل نے اندر قدم رکھا۔ ایک سرہانے اور دوسرے نے پائیتانے اپنی جگہ سنبھال لی —

''آج تو بھگوان کرپا سے آپ سوستھ دکھ رہے ہیں بابو جی—''

''ہاں—''

انیل دھیرے دھیرے پاؤں دابنے لگا—

نریندر نے سر کو سہلانا شروع کیا—

ذرا دیر میں اوما چائے اور بسکٹ کے ٹرے لے کر پہنچ گئی— پیچھے پیچھے تلسی بھی آ گئی— سب کو ایک ساتھ دیکھ کر بالمکند کو اچھا لگا— پھر سوچا، بچوں کا اس طرح ایک ساتھ آنا کسی مصلحت سے خالی نہیں۔

''ارے بات کیا ہے؟''

تلسی آگے بڑھی—''بڑوں کی سیوا تو دھرم ہے باؤ جی۔''

بالمکند مسکرائے۔ یہ پوچھتے ہوئے ڈر لگا کہ دھرم اچانک آج کیوں یاد آیا۔

انیل نے پوچھا—

''صبح میں پھوپھا بابو آئے تھے۔''

''ہاں۔''

''کچھ بات ہوئی آپ سے۔''

''ہوئی۔''

وہ چپ ہو گئے۔ دیکھا، انیل اور نریندر کی آنکھوں میں تجسس کے شعلے لپکے تھے۔

''کیا بات ہوئی—؟''

انہوں نے لیٹے لیٹے پاؤں موڑ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ نریندر اور انیل نے ہاتھوں کو پیچھے کر لیا—انہوں نے دونوں بہوؤں کی طرف دیکھا—وہاں بس اس سوال کی تہہ میں جانے کی جلد بازی دکھتی تھی۔

وہ مسکرائے—''بیٹو! ابھی نہیں مر رہا ہوں—تم ڈر گئے ہو کہ بوڑھا اب بھولنے پر آ گیا ہے—ڈرومت—اس حد تک بھولنے کی نوبت نہیں آئے گی۔''

انیل نے سر جھکا لیا—'باؤ جی—ہمیں ضرورت رہتی ہے—'

نریندر نے سر کھجلایا—

''روز روز کے تناؤ سے تو بہتر ہے باؤ جی کہ آپ بٹوارہ کر ہی دیں۔ آپ ہمارے ساتھ رہیں گے باؤ جی''—

اس نے اوما کی طرف دیکھا—

اوما چہرے پر دنیا جہان کا پیار سمیٹ کر بولی، ''آپ ہمارے ہی ساتھ رہیں گے باؤ جی۔ مالو بھی کتنا چاہتی ہے آپ کو—''

تلسی بگڑ گئی—''کیوں باؤ جی ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہیں گے۔ ہم کوئی اچھوت ہیں۔ یا ہم باؤ جی کو کھانا بنا کر نہیں کھلا سکتے۔''

''نہیں، یہ بات نہیں۔''

نریندر کی بات کو انیل غصہ سے کاٹا—''بات یہی ہے۔ ہماری خاموشی سے آپ لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ باؤ جی کو بہلا پھسلا کر ساری جائیداد اپنے نام کرا لیں گے۔''

نریندر نے باؤ جی کی طرف دیکھا۔

''دیکھا باؤ جی۔ یہ الزام ہم پر ہر گھڑی لگتے رہتے ہیں—لیکن ہم چھوٹے ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں بولتے ......لیکن اب......''

بالمکند نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھے اور بہوؤں کو روکا—من تلخی سے بھر اٹھا—جھنجھلاہٹ پر قابو نہیں رکھ پائے

''ابھی مر نہیں رہا ہوں۔ جب مروں گا تب دیکھا جائے گا—ابھی مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

●●

بچوں کے جانے کے بعد وہ دیر تک گم سم بیٹھے رہے۔ گھر ٹوٹ جائے گا کیا؟ دونوں بھائیوں میں تو اب ذرا بھی نہیں بنتی—سمجھانے اور سمجھنے کے دروازے پر بھی انجانا سا تالا لگ چکا ہے۔

بچوں نے اچھا خاصا موڈ خراب کر دیا تھا۔ وہ دیر تک کمرے میں ٹہلتے رہے۔

اس واقعہ کے دو تین روز تک بیٹوں اور بہوؤں کے منہ پھولے رہے سب کتنے مصلحت پسند ہو گئے ہیں—یہ بیٹے بہو ہیں—انہیں رونا آتا تھا

اِدھر دلی میں ہونے والی ریلی کے کچھ ہی ہنگامے تھے — نریندر کی مصروفیت اور ایکٹیویز کو وہ بھی دیکھ رہے تھے — بالمکند کو آتا، ادھر ملک میں ہونے والے فسادات کم پڑ گئے ہیں۔ جو اتنی بڑی ریلی نکال رہے ہیں۔ پورے ملک کو فساد کی آگ میں جھونک دیں گے یہ لوگ۔
ریلی کو لے کر شہر کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی — دہشت بھرا نریندر ریلی کے لئے دلی چلا گیا تھا — اوما کو ڈر لگ رہا تھا۔ مالو کی طبیعت کل سے ٹھیک نہیں تھی۔ کل سے دست قے آ رہا تھا — گھر میں مرد کی شکل میں کوئی نہیں تھا۔ پہلے تو وہ پڑوس کی دکان سے حال کہہ کر دوا لے آئی۔ مگر دوا کھانے کے باوجود رات تک طبیعت میں کوئی فرق نہیں آیا۔
گھر میں لے دیکر باؤ جی تھے —
کئی بار اوما کو خیال آیا۔ باؤ جی سے مالو کا حال کہیں — پھر سوچا باؤ جی تو خود بھی کمزور ہیں۔ باؤ جی کر ہی کیا سکتے ہیں — صبح تک امید تھی کہ مالو ٹھیک ہو جائے گی — مگر صبح تک امید تھی کہ مالو ٹھیک ہو جائے گی — مگر صبح تک مالو کی طبیعت بجائے ٹھیک ہونے کے اور خراب ہو گئی —
ایک بار تو ایسا ہوا کہ اوما ڈر گئی — مالو کی آنکھیں بند تھیں — اور وہ نیند میں جیسے کچھ بڑبڑا رہی تھی — سارا جسم کانپ رہا تھا۔
''مالو...... ارے او مالو......''
''مالو...... میری بچی......''
ارے...... آنکھیں کھول مالو —
ماں کا دل — اوما کے ہلانے ڈلانے پر بھی جب مالو نے آنکھیں نہیں کھولیں تو اوما روتی ہوئی باؤ جی کے کمرے کی طرف بھاگی۔
''باؤ جی!'' بالمکند بہو کی لرزتی آواز چونک کر بیٹھ گئے — بات کیا ہے بہو — ؟''
''مالو کچھ بولتی نہیں باؤ جی۔''
ارے کہتے ہوئے بوڑھا جسم سیڑھیوں سے نیچے آیا — کانپتا ہوا ہاتھ مالو کی پیشانی پر رکھا — پورا بدن پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔
بالمکند پریشان ہو گئے۔
''یہ کب سے جی خراب ہے۔''
''کل رات سے باؤ جی، دست آ رہا ہے — قے ہو رہا ہے۔ اتنی بار کہ میں پریشان ہو گئی۔''
''تم نے بتایا کیوں نہیں۔''
''آپ کو کیا بتاتی باؤ جی، آپ تو خود ہی بیمار ہیں۔''
''اب کیا کروں۔''
بالمکند کمرے میں ٹہلنے لگے — اوما رونے لگی — مالو کا جسم اب بھی رہ رہ کر کانپ اٹھتا — بالمکند نے دیوار گھڑی کی طرف دیکھا۔ گیارہ بج گئے تھے۔ گھر میں نہ انیل تھا نہ نریندر — مرد کی شکل میں کوئی بھی نہیں — اور وہ جانگر سے کمزور ٹھہرے — کہیں سے کوئی غیبی مدد آ جائے تو......
ٹھیک اسی وقت دروازے پر آواز ہوئی —
''بھائی جوش میاں — ارے بھائی تشریف رکھتے ہو۔''
''برکت حسین۔''
وہ تیزی سے باہر لپکے۔ برکت حسین ہی تھے۔ برکت حسین جوش کے گھبرائے چہرے کو دیکھ کر ڈر گئے۔
''بات کیا ہے جوش میاں۔''
''مالو کی طبیعت خراب ہے — گھر میں کوئی نہیں۔''
برکت حسین پھر رکے نہیں۔ اتنا پوچھا 'پڑوس میں کوئی ٹیلیفون ہے یا نہیں — منا سے بات ہوئے زمانہ ہو چکا تھا۔ مگر اس وقت معاملہ دوسرا

تھا۔ سامنے والی دکان سے منا کو فون لگایا تو منا مل گیا۔ انہوں نے منا کو سب کام چھوڑ کر بالمکند میاں کے یہاں آجانے کو کہا— آدھے گھنٹے کے اندر منا ڈاکٹر کو لے کر حاضر تھا۔ ڈاکٹر نے مالو کو چیک کیا۔ پھر بولے— اس کو تو ڈائریا ہے— جسم سے سارا پانی نکل گیا ہے۔ اس کو ابھی بھرتی کرنا ہوگا'

اوما رونے لگی۔

منا نے تسلی دی۔ ''گھبرائیے مت بھابی۔ ہم ہیں نا۔ آپ بے فکر رہیں۔''

ڈاکٹر کا اپنا نرسنگ ہوم تھا— منا اوٹو لے آیا۔

●●

سورج کا گولہ آگ برسا رہا تھا۔ گھر پر بالمکند اور برکت حسین رہ گئے تھے۔ دونوں بوڑھے خالی شطرنج نکالے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے— منا کا انتظار تھا۔ طبیعت رہ رہ کر پریشان ہو اٹھتی۔ گھڑی کی سوئیاں دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھیں۔

ایک بجے کے آس پاس منا آیا— منا نے اطلاع دی...... کہ ابھی پانی چڑھ رہا ہے اور آج رات مالو کو نرسنگ ہوم میں ہی رہنا ہوگا— فکر کی بات نہیں ہے۔ وہ شمیم کو بھی وہاں بھیج دے گا۔

●●

وہ رات قیامت کی رات تھی—

مالو اب تک نرسنگ ہوم کے بیڈ پر بے سدھ پڑی تھی— پانی چڑھ رہا تھا— صبح سے دوڑتے دوڑتے منا تھک چکا تھا۔ شام کو بالمکند اور برکت حسین بھی نرسنگ ہوم آئے تھے۔ منا نے پھر ان دونوں کو گھر پہنچا دیا— اب سوال تھا، بچے کے پاس رات میں کون رہے گا— اوما کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھیں—

باہر ستاروں کا جھل مل ایک قافلہ تھا— اوما دیوار سے خود کو ٹکائے دور تک تنی آسمانی چادر کو تک رہی تھی۔

منا ٹفن میں کھانا لے آیا— اسٹول پر بیٹھی بیٹھی شمیم کی جھپکی لگ گئی تھی—

اوما نے منا کو دیکھا—

''کھانا لے آئے؟''

''ہاں بھابی— آپ گھر چلئے، آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔''

اوما کو پس و پیش میں دیکھ کر منا دوبارہ بولا۔ ''گھبرائیے مت بھابی— انشاءاللہ تعالیٰ، اللہ نے چاہا تو صبح تک بھلی چنگی ہو جائے گی۔ یہاں ہم اور شمو بہت ہیں۔ آپ چلئے—''

اوما نے سامنے کھڑے فرشتے کو دیکھا، جسے بھگوان نے وقت پر مدد کے لئے بھیج دیا تھا۔

''بھیا، آپ...... کیسے احسان اتاروں گی آپ کا—''

اوما رونے کو ہو گئی—

''چلئے— گھر پر چچا بھی اکیلے ہوں گے۔''

●●

وہ رات گزر گئی— قیامت کی رات— اوما گھر تو آ گئی، مگر دل وہیں مالو میں لگا تھا— وہ بستر پر لیٹ تو گئی مگر دل اسی منا اور شمیم کی محبت میں الجھ کر رہ گیا تھا—

یہ لوگ...... کون ہوتے ہیں اس کے؟ خون کا رشتہ بھی نہیں ہے۔ پھر— صرف انسانی رشتہ کی مناسبت سے نا؟ وہ یہاں سو رہی ہے اور وہاں وہ اپنی نیندیں تباہ کر کے جاگ رہے ہوں گے— جبکہ آج تو سارے رشتے غرض کی ڈور سے بندھے ہیں— دوڑ دوڑ کر دوائی لانا۔ بھاگ بھاگ

کر ڈاکٹر کے پاس جانا۔اس کے پاس آکر تسلی دینا۔کون کسی کے لیے کرتا ہے آج کے سنسار میں اتنا۔

مالو کے لئے خطرہ اب بھی بنا ہوا تھا—

چھوٹی سی بچی— چہرے پر معصومیت،فرشتوں جیسی— مالو بے سدھ سی پڑی ہے۔منا دھیرے دھیرے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتا ہے۔شمو نیچے چادر بچھا کر سوگئی ہے— کسی کسی بچے کے چہرے پر کیسے دنیا جہان کا نور بھر دیتا ہے اللہ—

مالو نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں...... پانی—

منا نے دھیرے سے ہاتھ کے سہارے سے گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔مالو پھر لیٹ گئی—

منا نے راحت کی سانس لی— بچی کے چہرے پر چھائی ہوئی شانتی اور معصومیت اسے بہت بھلی لگی— وہ دھیرے دھیرے مالو کو تھپکنے لگا—

مالو کو نیند آ رہی تھی—

دوسرے دن مالو خود کو پہلے سے بہتر محسوس کر رہی تھی۔اس نے کھانے کے لئے بھی مانگا،ممی پاپا کے بارے میں پوچھا— ڈاکٹر نے بتایا کہ اب وہ خطرے سے باہر ہے اور آپ اسے لے کر گھر جا سکتے ہیں۔

مالو گھر آ گئی—

منا نے اجازت مانگی تو مالو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''رک جائیے انکل—''

اوما بولی— ''ہاں،رک جائیے نا بھائی صاحب۔ناشتہ وغیرہ کھا کر جائیے۔''

بالمکند شرما نے غور سے منا کا چہرہ دیکھا—

منا نے مالو کا سر پیار سے تھتھپایا۔

''بس تم اچھی ہو جاؤ بیٹا۔ہم آتے رہیں گے۔''

●●

شام تک مالو بالکل صحت مند ہو گئی۔چہرے پر رونق آ گئی۔بولنے بھی لگی— اس کی چہچہاہٹ پھر سے لوٹ آئی—

مالو نے پوچھا۔

''انکل نہیں آئے؟''

''ہاں ممی— انکل بہت اچھے ہیں۔انکل تو ساری رات جاگتے رہے۔''

''تم بھی تو سو گئی تھی۔''

مالو معصومیت سے بولی— ''پر نیند جب بھی ٹوٹتی انکل سر سہلا رہے ہوتے۔''

اوما نے مالو کی پیشانی سہلائی۔''ہاں،انکل اچھے ہیں...... بہت اچھے۔پر ابھی زیادہ بات مت کر— آج بھر آرام کر لے۔کل سے جتنی مرضی اچھلنا کودنا۔''

''اچھا ممی—''

مالو نے دھیرے سے آنکھیں موند لیں— ''لو سو گئی!''

اوما اس کی ادا پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی—

(۲)

ریلی کا ہنگامہ سماپت (ختم) ہو جانے پر پانچوں، نلکانی، سیدھیندو رائے، ڈاکٹر نویندو، نیل کنٹھ اور نریندر ایک کاریہ کرتا کے یہاں جمع

ہوئے — نلکانی باہر ہو گئے تھے۔ منا کی بغاوت کے بارے میں سن کر وہ چپ تھے۔ من ہی من کچھ سوچ وچار کر رہے تھے۔ مہانگری آ کر پارٹی نیتاؤں سے ملنے کے بعد ایک طرف جہاں وہ وجے لکچھ (جیت کی منزل) کی دشا میں بڑھنے پر خوش تھے، وہیں شہر میں ان کی کریا کلاپوں پر پارٹی نیتاؤں کی پرتیکریاں (REACTION) سے فکرمند بھی تھے۔

ڈاکٹر نویندو بولے۔ ''سب کئے کرائے پر پانی پھر رہا ہے۔ جب پارٹی کے لوگ ہی ہم سے ناخوش ہیں تو......''

نلکانی اپنی پرانی بات پر جمے تھے...... ہم ایک چھوٹا موٹا فساد نہیں کرا پائے — سدھیند ورائے بیڑی کا کش کھینچتے رہے —

ڈاکٹر نویندو غصے سے ابلے — ''جانتے ہیں انہوں نے کیا کہا۔ پارٹی ٹکٹ بھی چاہئے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے بھی رہیں گے آپ لوگ۔ اس سے کہیں پارٹی کا ہاتھ مضبوط ہوتا ہے۔''

''تو کیسے مضبوط ہوتا ہے۔'' نلکانی بھی تاؤ کھا گئے — ''سب سے ادھک چنتا تمہیں ہے ڈاکٹر نویندو۔ اس لیے کہ ٹکٹ کے اصلی بھاگیدار تو تم ہو۔ کیوں؟''

نویندو اچھل پڑے۔ ''مطلب؟ آپ کا مطلب؟''

سدھیند ورائے بس چپ چپ بیڑی کھینچتے رہے —

نیل کنٹھ اور نریندر چونک پڑے —

نلکانی اپنی مہین آواز میں بولے — ''ہم تو بس بیکار پڑے ہیں — جتنا ہم سے بنتا ہے سو ہم کرتے ہیں۔ آگے کی چنتا اسے ہو، جسے ٹکٹ ملنا ہے —''

سدھیند ورائے نے چپل سے بیڑی مسل دی۔ ''نلکانی جی! یہ سمے آپسی جھگڑے کا نہیں ہے —''

نریندر بولا۔ پارٹی نیتاؤں نے یدی ہماری آلوچنا کی ہے تو کون سا غلط کیا ہے —

ہم اپنے چھیتر میں پارٹی مضبوط بھی کرنا چاہتے ہیں اور اب تک ہماری کوئی بھی راجنیتک چال سپھل نہیں رہی۔''

ڈاکٹر نویندو ملائمیت سے بولے — آپ غلط سمجھتے ہیں ہمیں نلکانی جی — ٹکٹ آپ چاہیں تو بے شک آپ لے لیں۔ لیکن آپس میں یہ من مٹاؤ نہیں ہونا چاہئے۔'

نلکانی تھوڑا نرم پڑے۔ نہیں معاملہ ٹکٹ کا نہیں ہے۔ خیر چھوڑو۔ میرا بھی سر گھوم گیا تھا۔ کیا کروں۔ وے سمجھتے ہیں۔ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں ہم نے کیا کچھ نہیں کیا۔ پھر بھی اسپھل کے اسپھل رہے —'

دل چھوٹا مت کیجئے۔ ڈاکٹر نویندو پلٹ کر مسکرائے۔ رات ہماری ہے۔ واپسی کل ہے۔ آپ کہیں تو آج جشن ہو جائے۔ آج آپ کو بہترین وہسکی پلواتا ہوں۔'

نیل کنٹھ بولا۔ 'ہماری بھی پسند کا خیال رکھیے گا۔ چناؤ میں ہم ہی کام آئیں گے۔'

''کیوں نہیں۔''

ڈاکٹر نویندو اٹھ کھڑے ہوئے — باہر ٹیکسی کھڑی تھی۔ پانچوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے —

پینے پلانے کے بعد رات ۹ بجے تک یہ ہوٹل میں لوٹ آئے — ہر ایک کو تھوڑا بہت نشہ چڑھا ہوا تھا۔ مگر طے یہ پایا تھا کہ آج رات ہی کل ملا کر یہ اپنے آگے کی اسٹریٹجی طے کریں گے —

نلکانی کچھ زیادہ ہی لڑکھڑا رہے تھے —

''سنبھلئے۔ ارے سنبھلئے صاحب۔''

ڈاکٹر نویندو نے انہیں کرسی پر سیدھا کیا۔

''ایک ہی راستہ ہے۔''

نلکانی مسکرائے — منا کو مروا دو۔''

نریندر اور نیل کنٹھ ایکدم سے چونک پڑے۔ جبکہ سدھیند ورائے ایک دوسری بیڑی جلا کر چپ چاپ کش کھینچتے رہے۔

''اور یہ کام تم کرو گے؟'' انہوں نے نیل کنٹھ اور نریندر کی طرف اشارہ کیا۔

''کیوں؟''

نلکانی بولے — اس پر ادھک سوچ وچار کا سمے نہیں — بس یہی ہم نے طے کیا ہے۔

دونوں نے چونک کر ڈاکٹر نویندو کو دیکھا۔ ڈاکٹر نویندو نے دھیرے سے اپنی گردن ہاں میں ہلا دی۔

''یعنی؟''

''مطلب مت پوچھو نریندر — '' نلکانی اب بھی نشے میں جھوم رہے تھے۔ سمے کم ہے — ''

''لیکن ہتیا — ''

نلکانی سرک گئے۔ تم اسے ہتیا کہتے ہو — دھرم کے کام میں ہتیا۔ اپرادھ جیسے شبد نہیں ہوتے۔ یہ دھرم کا کام ہے۔ پارٹی کا تو ہے ہی۔ پارٹی سے بڑھ کر دھرم کا ہے — اور دھرم نے ستیہ کے لیے کئے گئے یدھ کو کبھی غلط نہیں کہا۔ یاد ہے ارجن نے آمنے سامنے کھڑی سینا کو دیکھ کر شری کرشن سے کیا کہا تھا —

ہے واسدیو، ہے شری کرشن، یدھ کے ابھیلاشی اس سمودائے (بھیڑ) کو دیکھ کر میرے انگ (اعضاء) شتھل (ٹھنڈے) پڑ گئے ہیں — مکھ سوجا جا رہا ہے میرے شریر میں کمپن اور رومانچ ہو رہا ہے۔ ہاتھ سے گانڈیو دھنش چھوٹا جا رہا ہے۔ تو چا جل رہی ہے۔ ہے واسدیو، یدھ میں اپنے ہی لوگوں کو مار کر میں اپنا کلیان نہیں دیکھتا ہوں۔ ہے کرشن۔ میں وجے نہیں چاہتا۔ میں راجیہ اور سکھ نہیں چاہتا۔ ہے گووند...... مجھے راجیہ، بھوگ اور جیون سے کیا واسطہ؟ ہمیں جن کے لیے راجیہ بھوگ اور جیون چاہئے۔ وے ہی دھن اور پران چھوڑ کر یدھ میں کھڑے ہیں — آچاریہ، تاؤ، چاچا، بھائی، بندھو، دادا، ماما، سسر، ہے مدھوسدن! تین لوگوں کے راجیہ کے لیے بھی میں انہیں مارنا نہیں چاہتا — ہے جناردن، دھرت راشٹر کے پتروں کو مار کر ہمیں کیا ملے گا۔

نلکانی بولتے بولتے لڑکھڑائے۔ یاد کرو پھر واسدیو نے کیا کہا تھا — شری کرشن ارجن کے کتھن کو آتما کی دربلتا مانتے تھے — انہوں نے سمجھایا۔ دیہہ (جسم) ناشوان ہے۔ اسے نشٹ ہونا ہے۔ مرتیو کے سمبندھ میں شوک کرنا نرتھک ہے۔ یہ اگر تیرے بھائی ہوتے تو رن بھومی میں تم سے ملنے کیوں آتے — انہوں نے ارجن کی نندا کی کہ وہ دھرم یدھ سے بھاگ رہا تھا —

نلکانی کی آواز میں اب بھی لڑکھڑاہٹ تھی۔ نریندر، اس لئے یہ بھی دھرم یدھ ہے۔ یہ ہمارا دیش ہے پرنتو ہمارا نہیں لگتا۔ ہم جیسے چاہتے ہیں، ویسے اس کو بنا کر نہیں رکھ سکتے۔ ہم آپس میں بھی لڑتے رہتے ہیں۔ اتیو ہمیں لڑایا جاتا رہا ہے — ہماری بدھی بھرشٹ ہوگئی ہے — ہم ایک گئو ہتیا تک نہیں بند کرا سکے — ہم کچھ کہتے ہیں تو آیوگ، ابھیوگ کے چکر میں پڑتے ہیں۔ ہم سے ادھک مہا مورکھ کون ہوگا نریندر — ؟

اب ایک اَوَسر (موقع) ملا ہے ہمیں — اتیت جیسا بھی بیت گیا پر ورتمان سامنے ہے — ہم اپنے بھوش (مستقبل) کو اپنے طور پر آکار دیں گے — کیوں نریندر — یدھ میں نشور دیہہ یدی مرتیو کو پراپت ہو کر ہمیں کچھ دے سکتا ہے، تو ہماری سپھلتا، ہے — ''

نیل کنٹھ نے سگریٹ جلائی۔ وہ سوچ میں ڈوب گیا...... تو کیا اس کے لئے ہمیں اپنا ہاتھ خون سے رنگنا ہوگا —

''پھر وہی مرکھتا۔ نلکانی بولے۔ پانی پیتے ہو کہ نہیں۔ جل میں دکھائی نہیں پڑنے والے اسنکھ جیو تیرے ہوتے ہیں۔ بھوجن کے ساتھ ہم کتنے جیو کو نوالہ بنا لیتے ہیں۔ چلتے پھرتے ہمارے پاؤں کے نیچے کتنے ہی جیو آ کر کچل جاتے ہیں — کبھی کبھی شانتی کے لئے بھی یدھ کرنا پڑتا ہے اور یہ اوسر ہے ایک لمبے سمے کے بعد پراپت ہونے والے شبھ اوسر کا — یدی ہم اس بار بھی پرشنوں میں الجھ گئے تو پھر ہماری جڑیں اس بھومی سے

سماپت ہونے میں سمے نہیں لگے گا—''

نلکانی نریندر کی طرف گھومے۔ نریندر۔ واستو یکتا (حقیقت) یہ کہ چار دنوں میں تو ہمیں بھی اس بچے سے پریم ہو گیا ہے۔ بھیتر سے ابھیمانی ہے—بولنے میں سنکوچ کرتا ہے—ہمیں بھی اچھا لگتا ہے وہ۔ لیکن اچھا لگنے سے کیا ہوتا ہے۔ دشترتھ کی اِچھا تھی کہ رام کو چودہ ورشوں کے بن واس پر بھیج دیا جائے۔ یہ سب سمے کراتا ہے نریندر—اب تم بھی سنکوچ مت کرو—''

رات ڈوبتی جارہی تھی۔ نشہ گہرا ہوا جارہا تھا۔ نلکانی کی آنکھوں میں نشے کے ڈورے کچھ زیادہ ہی گہرے ہوتے جارہے تھے—ڈاکٹر نویند وچت لیٹ گئے تھے—ذرا دیر میں ان کے خراٹے بھی گونجنے لگے—

نریندر نیل کنٹھ کو لے کر ہوٹل کی بالکنی میں آ گیا—اندر ایک بھیانک طوفان مچا ہوا تھا—دونوں ہی خاموش تھے اور ہوٹل کے سامنے کی جھل مل، جھل مل کرتی روشنیوں کو تک رہے تھے۔

(۳)

نریندر گھر آیا تو جیسے چاروں طرف منا کے نام کے کیسٹ بج رہے تھے۔ باؤ جی ہوں، اوما یا مالو......سب کے ہونٹوں پر منا کا نام ایسے سجا تھا جیسے فرشتوں یا بھگوان کا سجتا ہو—

مخالف حالات—ہم سوچتے کچھ ہیں اور حالات آنکھوں پر پٹی چڑھا کر' کچھ کے لئے مجبور کر دیتے ہیں—

اوما کی نظروں بھائی صاحب کا درجہ کچھ اتنا بڑھ گیا تھا کہ آدر، احترام اور عقیدت کے چرنوں کو چھو گیا تھا۔ بھائی صاحب نے یہ کیا...... بھائی صاحب نے وہ کیا—وہ تو بھگوان نے فرشتوں کو بھیج دیا۔ کیا بتاؤں۔ کیسی طبیعت ہو گئی تھی مالو کی۔ کیسے کیسے کر رہی تھی—بھابی تھیں اور بھائی صاحب تھے۔ ساری رات اسپتال میں جاگتے رہے۔ ہمیں کچھ کرنے نہیں دیا۔

اوما بولی—'جاؤ مل آؤ نا۔ برکت چاچا کے یہاں—

برکت چاچا!

نریندر کے لئے یہ چونکنے کا مقام تھا۔ کہاں تو بڈھے کے گھر میں گھستے ہی اوما ناک بھوں چڑھاتی تھی—غصے میں ابل پڑتی تھی......اب باؤ جی چائے کے لئے تنگ کریں گے۔ ہاں بڑے میاں کو بھی گھر پر نہ کام نہ دھندہ۔ بس چلے آتے ہیں ہمیں پریشان کرنے—ان داڑھی والوں اور ٹوپی والے ملاؤں سے تو اوما کو جنم واسطے کا بیر تھا۔

مگر اچانک......

''برکت چاچا......'' نریندر مسکرایا—'ایک ہی دن میں بڑے میاں چاچا بن گئے۔

اوما چپ نہیں بیٹھی، جھٹ سے جواب دیا۔ آنکھیں کھلنے کے لئے دن اور یگ کیا ایک پل کافی ہے—سوچ بھی رہی تھی۔ تم سے کچھ کہوں گی، باتیں کروں گی

''کیا؟''

''غصہ نہیں کروگے تب بولوں گی۔''

''غصے والی بات ہوگی تو کروں گا ہی—''

''تب نہیں بولتی—''

''بولنا، کیا خوشامد کرا رہی ہو—''

''اچھا بولتی ہوں—راج نیتی چھوڑ کیوں نہیں دیتے—بزنس میں دل لگاؤ یا جس میں تمہارا دل لگے۔''

''صاف صاف کیوں نہیں کہتی —''

اوما کو جھٹکا لگا— ''ایک بات بتاؤں۔کل سے باؤ جی سے بھی بہت پریم بڑھ گیا ہے —''

''پہلے نہیں تھا کیا؟''

''تھا کیوں نہیں — لیکن اتنا نہیں تھا— ہاں سنو —''

نریندر نے گھور کر دیکھا— ''ایسا کیا کر دیا اس نے کہ تم سب پر جادو ہی کر دیا۔ ارے بیماری اور دکھ سکھ میں پاس پڑوس والے تو کام آتے ہی ہیں۔ اس میں انوکھا کیا ہے۔''

''انوکھا میں نہیں جانتی — اس نے میرے مالو کی جان بچائی ہے بس اتنا جانتی ہوں۔ اور اتنا جاننے سے کئی اور بھی باتیں بھی صاف ہو گئی ہیں ۔''

''جیسے؟''

جیسے مسلمان برے نہیں ہوتے — ہماری اماں بھی مسلمانوں کو برا کہتی تھیں۔ ڈرتی تھیں۔ سب من کا میل ہے نریندر — بچپن سے بھیتر بیٹھایا گیا ڈر کیوں، اب بھائی صاحب کو ہی لو —''

''بھائی صاحب —'' نریندر کو غصہ آ گیا —

اوما اپنی دھن میں کہتی گئی۔ بچپن میں کیسی کیسی باتیں سنتی تھی۔ میاں جی کے محلے میں جاؤ تو مار دیتے ہیں۔ شیروانی اور کرتے کے اندر چاقو اور چھرا چھپا کر رکھتے ہیں — نہاتے نہیں ہیں — تلوار کے زور پر مسلمان بناتے ہیں — ہمارے مندروں کو توڑتے ہیں —''

''تم نے راج نیتی چھوڑنے کی بات کیوں کی؟''

''سچی بولوں تو پھر بگڑ جاؤ گے —''

''مت بولو۔ سمجھ گیا، تم پاگل ہو گئی ہو — کوری بھاوکتا (جذبات) میں بہہ گئی ہو۔''

''نا — پر یاوشواش ہوا ہے کہ جو راجنیتی فرق پیدا کرتی ہے وہ غلط ہے —، جو نفرت سکھاتی وہ غلط ہے — جو بھید بھاؤ اور ذات پات پھیلاتی ہو وہ غلط ہے —''

نریندر کو غصہ آ گیا — ''یہ آدرش وادیوں والی بات چھوڑ دو، کیا غلط ہے اور کیا صحیح ہے۔ یہ سوچنا مجھے بھی آتا ہے۔''

اوما کو برا لگا۔ ''تمہاری جگہ کوئی دوسرا باپ ہوتا تو وہ بھائی صاحب کا دھنیواد دینے ضرور جاتا۔ اور ایک تم ہو۔ یہاں بیٹھے ہو، ناراض ہو رہے ہو ۔''

مالو اسکول کی کاپی کھولے پاپا پاپا کہتی ہوئی اندر آ گئی۔

''کیا ہے؟''

''یہ Math دیکھنا پاپا۔''

نریندر نے کاپی دیکھی — 'ٹھیک ہے۔ اب جاؤ کھیلو!'

''انکل —؟''

نریندر چونک کر اوما کو دیکھا۔

اوما مسکرائی۔ 'بھائی صاحب کو کہہ رہی ہے۔'

''ہم انکل کے یہاں کب جائیں گے پاپا؟'' مالو پیار سے پوچھ رہی تھی۔

نریندر پوری طاقت سے غصہ ہوا — ابھی ماتھا مت چاٹو — ابھی جاؤ پڑھو۔''

مالو سہم گئی۔ نریندر کو احساس ہوا۔ بیٹی پر اتنے زور سے بگڑنا نہیں چاہئے تھا۔

''سنو مالو—''اس نے آواز میں نرمی پیدا کی—''چلیں گے بیٹا۔ ابھی ہم تھکے ہوئے ہیں نا— چلیں گے—''
لیکن اس کی نرمی کے باوجود مالو اب تک سہمی ہوئی تھی—وہ پھر رکی نہیں، تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

••

نریندر سگریٹ کبھی کبھار ہی پیتا تھا۔ بالکنی پر آ کر اس نے سگریٹ سلگا لیا— سگریٹ کے لمبے لمبے کش کھینچنے لگا......لگا آنکھوں میں ڈھیر سی پر چھائیاں سمٹ رہی ہوں...... یہاں ان تین چار دنوں میں جیسے کوئی معجزہ ہو گیا۔ کوئی کرشمہ ہو گیا—اور یہاں......اس کے ذہن میں لگا تار دھماکے ہو رہے تھے— جیسے ڈھیر سارے بم، گولے چھوٹ رہے ہوں۔ آنکھوں کے آگے نلکانی کا چہرہ بار بار ابھر رہا تھا......تم اسے ہتیا کہتے ہو۔ دھرم کے کام میں ہتیا، اپرادھ جیسے شبد نہیں ہوتے......دھرم نے ستیہ کیلئے کئے گئے یدھ کو کبھی غلط نہیں کہا۔
اسے محسوس ہوا......نلکانی نے ایک بھرا ہوا پستول اسکی کھلی ہتھیلیوں کی طرف بڑھایا ہو......
''لو......شاباش—''
اس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ آگے کر دیا—

••

خدا حافظ

ان چند دنوں میں بہت کچھ ٹوٹا تھا اور بہت کچھ بنا تھا۔ بہت سے پرانے غلط ثابت ہوئے تھے اور ذہن کے بند گوشوں پر نئے خیالات نے اپنا قبضہ جمایا تھا—مالو کی بیماری کے بعد اوما اور شمیم جیسے سہیلیاں بن گئیں۔ مالو چھوٹی سی نشی کو بہت چاہنے لگی۔ وہ گھر پر بھی ہوتی تو ماں سے نشی کے بارے میں پوچھتی رہتی۔ وہ کیا کھا رہی ہوگی؟ رو ہی ہوگی؟— کسی چیز کے لئے ضد کر رہی ہوگی......
ان چند دنوں میں سب سے بڑی تبدیلی اوما میں آئی تھی— بھائی صاحب نے صرف اوما کا دل ہی نہیں جیتا تھا بلکہ اوما تو پوری طرح سے بھائی صاحب کی بھگت بن گئی تھی—وہ اوما، جو چھوا چھوت کے بیچ پلی بڑھی تھی۔ مجال کہ کسی مسلم گھرانے میں کھانا کھا لے یا گلاس میں پانی پی لے — گھر پر بھی کوئی 'ملا' آ جاتا تو وہ دیکھ بجا کر دیتی یا پھر واپس آنے پر رسوئی میں کنارے رکھ دیتی اور خوب صاف کراتی۔ وہی اوما، سوچ کے 'دہرا تل' پر اب پر میپراؤں کے کتنے ہی پرانے کپڑے اتارنے پر تیار ہو گئی تھی۔
سچ کیا ہے؟
زندگی میں کبھی اسے، اس سامنے کے سچ کو سویکارنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی— پرمپرائیں رسم و رواج سب اپنی جگہ ہیں اور ملنا جلنا اپنی جگہ —اور ملنے جلنے میں دھرم کا ستیاناس تو نہیں کیا جا سکتا۔ وہی اوما اب نئے سرے سے سوچ رہی تھی۔ اوما سمے بدلا ہے۔ جو فرشتے سمے پر تیری مدد کو آئے۔ وے کون تھے؟ ناحق چاروں طرف آگ پھیلی ہے۔ ان آگ پھیلانے والوں کے لئے اس کے من میں کافی غصہ بھرا تھا۔
اب وہ مزے سے شمیم کے یہاں کھا پی بھی لیتی— بلکہ مانگ بھی لیتی۔ سویاں نہیں پکی ہیں— مجھے پلاؤ بنانا سکھا دو— شیر مال روٹی، حلوہ سوہن— باؤ جی کو کھلاؤنگی۔ وہ خوش ہو جائیں گے۔

••

ادھر چند دنوں میں، بالمکند شرما جوش کی صحت پر بھی کافی اثر پڑا تھا— حالات نے دماغ پر بھی اثر ڈالا تھا— کئی دنوں سے کیفیت یہ تھی کہ کسی سے باتیں نہیں کرتے تھے۔ بلکہ چپ چاپ بت بنے رہتے— بہت بہت یہی ہوتا کہ اپنی کتابوں کو، برسوں میں جمع کی گئی کتابوں کو آہ بھر کر دیکھا کرتے— کسی کسی نادر کتاب کو نکال کر انگلیوں سے سہلایا کرتے پھر میز پر بیٹھ کر کچھ لکھنے کی کوشش کرتے مگر ذہن میں اس قدر ہلچل مچی ہوتی کہ کچھ بھی لکھ نہیں پاتے— غصہ آتا تو کاغذ مروڑ کر ڈسٹ بن میں ڈال دیتے۔ اب کاغذ کی موڑی گئی ایسی کتنی ہی تھیلیاں ڈسٹ بن میں جمع ہو گئی تھیں......

کبھی کبھی ٹہل ٹہل کر کسی پرانے شعر کو یاد کرنے کی کوشش کرتے مگر حالات نے حافظے پر بھی اثر ڈالا تھا......
آنکھوں میں آنسوں آجاتے تو گنگناتے......
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں—
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں—
آواز بھاری ہو جاتی تو دروازے پر پڑنے والی تھاپوں پر کان لگاتے— کئی دن ہو گئے۔ برکت حسین نہیں آئے— بھائی برکت حسین۔ اب تو یہ پردہ بس اٹھا چاہتا ہے— آخری دیدار نہیں کرو گے میاں......بس اب ستاؤ نہیں میاں۔ آجاؤ— نہیں آتے۔ جاؤ مت آؤ— یہ آندھیاں تو سبھی چراغ گل کئے دے رہی ہیں— اب تم کیا آؤ گے میاں۔ اب ہم بھی چلے— اب یہاں سے جی روٹھ گیا میاں۔
خالی بساط نکال کر بیٹھ جاتے— یادوں کی آندھیاں چلتیں تو خالی بساط پر ٹپ سے کوئی آنسو کا قطرہ گر پڑتا۔ مگر وہاں اس زخمی قطرے کا پرسان حال ہی کون ہوتا—
انیل اور نریندر کو بھی لگ رہا تھا کہ اب باؤ جی کی 'چلی چلی' ہے— یہ خاموشی اچھی نہیں—
انیل کو غصہ آتا تھا— باؤ جی خود تو چلے جائیں گے اور جائیداد کے لئے ہمیں لڑنے مرنے کے لئے چھوڑ دیں گے—
نریندر کو غصہ کم آتا تھا۔ لیکن نریندر بھی یہی سوچ رہا تھا۔ باؤ جی اپنی زندگی میں اگر بٹوارہ کر دیتے تو کیا بگڑتا— اور باؤ جی تھے کہ بٹوارے کے نام پر دونوں کا چہرہ ٹکر ٹکر گھورتے۔ پھر ایک مایوس کن سانس چھوڑ کر لیٹ جاتے— کہ میاں، بٹوارے کے بعد بھی، کون جانے، تم آپس میں مل کر رہتے ہو یا ایک دوسرے سے جھگڑتے ہو، پھر بٹوارہ کیا کرنا۔ آگے کا خدا حافظ—

●●

اور سچ مچ اس مکان کا خدا حافظ تھا۔ باؤ جی کے بیٹھکے پر انیل کی نظر تھی۔ وہ اسے اپنا بزنس چیمبر بنانا چاہتا تھا— وہ باؤ جی کے کمرے میں جب بھی آتا۔ خالی پڑے، space کو دیکھ کر سوچا کرتا......صوفے کہاں لگیں گے visitors کے بیٹھنے کی جگہ کون سی ہوگی— فائلیں کہاں رکھی جائیں گی......
باہر کے حصے پر نریندر کی نظر تھی— پارٹی میں اپنا اثر رسوخ اور دبدبہ قائم کرنے کے لئے وہ یہ جگہ پارٹی آفس کے نام کرنا چاہتا تھا۔ اور یہ بات اسے بخوبی پتہ تھی کہ باؤ جی کی زندگی تک یہ ممکن نہیں— ایک دوبار اس سلسلے میں اس نے دبی زبان میں باؤ جی سے بات کرنے کی کوشش کی تو باؤ جی نے ایسے دیکھا جیسے وہ ان کی موت کا سودا کرنے آیا ہو— پھر اس کی ہمت نہیں ہوئی— شہر کے آسمان پر فرقہ واریت کے گدھ لگاتار گھوم رہے تھے—

(۲)

شام کی پرچھائیوں نے شہر کو ڈھک لیا تھا۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب دفتر کے اوقات ختم ہوتے ہیں اور تھکے ہارے لوگوں کا قافلہ دفتروں سے نکلتا ہے اور سڑکوں کی طرف کوچ کرتا ہے۔ چائے خانوں اور پان کی دوکانوں پر رونق آجاتی ہے۔ چوراہوں پر رکشے، ٹم ٹم والے اور راوٹوں والے کے ہنگامے گونجنے لگتے ہیں— جھنڈ کے جھنڈ لوگ دفتروں سے باہر نکلتے ہیں اور ایک دوسرے سے باتیں کرتے، قہقہے چھوڑتے، گھر کی طرف چل پڑے ہیں—
دفتر کب کا اٹھ چکا تھا۔ لیکن آج منا کے نصیب میں کچھ زیادہ ہی کام تھا۔ کچھ واؤچر چیک کرنے تھے۔ کچھ حساب جوڑنے تھے۔ اس لئے دوسرے ساتھیوں کے جانے کے بعد بھی وہ اپنی جگہ بیٹھا تھا اور فائلیں چیک کرتا رہا— آج صبح سے ہی منا کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ صبح میں اٹھنے کے بعد پتہ نہیں کیا جی چاہا کہ نشی کو اٹھا کر خوب خوب پیار کرنے لگا۔
شمیم نے ٹوکا۔ آج دفتر مت جایئے۔

منا کے دل میں پھر سے ہلچل ہوئی—

''کیوں نہیں جاؤں؟''

ایک دن نہیں جانے سے کا ہوگا؟''

''نہیں جانے کی کچھ تو وجہ ہونی چاہئے۔''

''بھرا بھرا گھر اچھا لگتا ہے......''

شمیم کہتے کہتے رک گئی—

''نہیں جانا ضروری ہے—''

منا دفتر تو آ گیا۔لیکن شمیم کی کہی گئی بات اسے بار بار یاد آ رہی تھی۔ایک دن نہیں جاتا تو کیا ہو جاتا— گھر میں رہتا۔ بیوی بچوں کے سنگ—دل کا دھڑ کنا بدستور جاری تھا—

●●

بجلی آفس کے ٹھیک سامنے، سڑک کے اس پار چائے اور پان کی دکان پاس پاس تھی۔دکان کے پاس رکشے والے 'چوک' چوک' چلاتے ہوئے آدمیوں کے ہجوم کی طرف دیکھ رہے تھے۔اس ہجوم میں سے ایک آدمی نکلا۔چار خانے کی لنگی پہنے۔ایک چور ملیدہ کرتا پہنے اور سر پر گول ٹوپی—قد ٹھگنا۔وہ سامنے سے آتے ہوئے رکشہ والے سے ٹکراتے ٹکراتے بچا—پھر پان والے کی دکان کے پاس کھڑا ہو گیا—وہ کوئی ایسا آدمی نہیں تھا جس پر بہت دھیان دیا جاتا یا اس کی حرکتوں پر غور کیا جاتا—اس کی نظر بھی آفس کے گیٹ پر ٹکی تھی—دیکھنے میں بس وہ ایک عام سا ملا نظر آ رہا تھا۔

کافی دیر بعد گیٹ پر منا کا چہرہ نظر آیا۔چہرے سے وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔منا گیٹ پر ایک لمحے کو ٹھہرا۔پھر دائیں طرف مڑ گیا۔

رکشے والے اب بھی چیخ رہے تھے...... چوک چلو۔چوک چلو۔

ایک نے پوچھا—

''چوک چلنا ہے بابو جی۔''

''نہیں۔''

منا نے سر ڈلا دیا—

اور دیکھتے دیکھتے سڑک پر ہنگامہ مچ گیا—چیختا تڑپتا ہوا منا زمین پر گر پڑا کچھ لوگوں نے تیزی سے لنگی اور ٹوپی پہنے، ملا کو بھاگتے ہوئے گلی میں دیکھا تھا۔

سڑک پر افراتفری مچ گئی—شہر کی فضا مہینوں سے خراب تھی۔اس لیے کسی نے بھی جائے واردات پر رکنا مناسب نہیں سمجھا۔جس کو جہاں موقع مل رہا تھا تیزی سے بھاگ رہا تھا—

دکانوں کے شٹر جلدی جلدی گرنے لگے۔

کچھ ہی دیر میں پولیس کا سائرن بھی سڑک پر گونجنے لگا—

●●

نیل کنٹھ کی جیپ تیزی سے نلکانی کے گھر پر رکی۔نریندر اور نیل کنٹھ جیپ سے اتر کر تیزی سے گھر کے اندر بڑھ گئے—

نریندر کا چہرہ ستا ہوا لگ رہا تھا۔

نیل کنٹھ کے چہرے پر بھی تھکاوٹ کے آثار تھے—

''پریشان ہوا!''

''نلکانی نے گلاس آگے بڑھایا۔''

''ہاں—''

ملاکہاں گیا—؟

''اسے دوچار دن کے لیے لاپتہ کرنے کا انتظام ہوگیا ہے۔ پکڑا گیا تو باقی معاملات بعد میں سنبھال لیے جائیں گے—''

''ہونہہ—''

نلکانی نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''ڈاکٹر نویندو سے ملے؟''

''نہیں—''

''عام مسلمانوں کی کیا پرتیکریا Reaction ہے؟''

نیل کنٹھ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا— ''یہ خبر پھیل چکی ہے کہ کسی مولوی نے مارا ہے— کیوں مارا ہے کا جواب اتنا ہے کہ اپنے مذہب کا ہوتے ہوئے بھی منا اپنے مذہب کے خلاف لوگوں کا بھڑکا رہا تھا— سبھی منا کے خلاف ہو رہے تھے۔ اس لیے منا کے بارے میں جانے کا کسی کو غم نہیں ہے—''

نیل کنٹھ چپ ہوا تو نلکانی نے اسے غور سے دیکھا۔ نلکانی کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس کے برخلاف چہرے پر ایک ہلکی سی اداسی دیکھی جا سکتی تھی......

''بیچارہ—'' وہ دھیرے سے بڑبڑائے— ''یہ خبر ہم پانچ لوگوں کو ہے۔ ہمیں تم دونوں کو سیندھوا اور ڈاکٹر نویندو— پارٹی کا یہ کرتاؤں میں اس کا Reaction کیا ہے؟''

نیل کنٹھ بولا— ''میں کچھ سے مل کر آ رہا ہوں۔ سب جگہ آکروش ہے—''

''اور شہر کا واتاورن؟''

نریندر دھیرے سے بولا—

''کیا جو ہوگیا ہے وہ کافی نہیں ہے۔''

اس کی آواز دم توڑتی ہوئی تھی—

نلکانی چونک گئے— نریندر۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو نریندر؟''

نیل کنٹھ نے دیکھا۔ نریندر کے چہرے پر ایک عجیب سا پیلا پن خوف کی طرح چھایا تھا۔

نلکانی ٹھہر کر بولے۔ ''پانی پیو— تم کیا سوچتے ہو نریندر۔ ہمیں کوئی خوشی ہے ایسا کرتے ہوئے، ہمیں سکھ ملا ہے— ارے بھائی تھا ہمارا وہ۔ ان چند دنوں میں جگری یار بن گیا تھا اپنا— نریندر ہم کوئی دشمن تھے اس کے— کیوں نیل کنٹھ—''

نلکانی کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے— ''تم کیا جانو نریندر۔ میں اسے کتنا ماننے لگ گیا تھا۔ تم سے، نیل کنٹھ سے بھی زیادہ۔ وہ چپ رہتا تھا۔ مگر بات پلے درجے کی بولتا تھا— میں اسے بیٹے کی طرح چاہتا تھا۔ ہاں نریندر۔ شاید تم اسے مت مانو۔ مگر یہی صحیح ہے۔ میں اسے پریم سے ادھک اور وشواس سے کم چاہتا تھا۔ اس لئے کہ یدی کسی سے پریم کرو تو بڑھتا جاتا ہے۔ ادھک وشواس کرو تو وشواس ایک موڑ پر آ کر گھسی ہوئی رسی کی طرح کمزور اور ٹوٹنے لگتا ہے— وہ بھی گھسنے اور ٹوٹنے لگا تھا—''

نلکانی کے آنسو اب کپول (گال) پر بھی تیرنے لگے تھے۔ نلکانی نے کھردرے ہاتھوں سے آنسو صاف کئے۔ پھر بولا—

''وہ بیٹے سے بڑھ کر تھا ہمارے لیے۔ پرنتو۔ ہمیں کھید تو اسی بات کا ہے کہ وہ ایک بھینکر قسم کی دویدھا میں پھنس گیا تھا— اور ہمیں دھرم کے

لیےاسی کا بلیدان لینا پڑا— تم کیا سمجھتے ہو۔کیااس کے بلیدان سےہمیں پر سنتا ہوئی ہے۔؟''

ٹھیک اسی سمے دندناتے ہوئے سدھیند ورائے پہنچے— ''کیا خبر ہے؟''

نلکانی جیسے اسی کا انتظار کر رہے تھے—

''منا نے اسپتال پہنچتے پہنچتے دم توڑ دیا—اور۔''

''اور کیا—؟''

ہمارے کار یہ کرتاؤں نے غصے میں کھیم پورا اور اکبر پورہ میں کئی دکانوں جلا کر راکھ کر دیں—

باہر گاڑی رکی تھی۔ڈاکٹر نویندو دھیرے دھیرے نپی تلی چال سے اندر آئے—

''ہاتھ ملاؤ نلکانی—''

انہوں نے اپنا ہاتھ جوش میں آگے بڑھایا—

''فساد بڑھ رہا ہے—اب یہ فساد جلد نہیں رکے گا—''

نلکانی کسی سوچ میں ڈوبے رہے— انہوں نے ڈاکٹر نویندو کی طرف ہاتھ بڑھایا— گہری سوچ میں ڈوبے، صرف ان کے ہونٹوں سے اتنا نکلا۔

''کیول دھرم کا کام—ورنہ یدھ کسے پسند ہے؟ کیول ایک لمبے انترال سے چلی آرہی داستان کی سماپتی کے لیے— کبھی کبھی دھرم چھیتر اور کرم چھیتر کی آوشکتا پڑتی ہے— نیل کنٹھ، کورو اور پانڈو کا یدھ کیا تھا؟ بھائیوں کا یدھ تھا کیا؟ نہیں نا۔ ستیہ، استیہ، جھوٹ وشواس، گیان آگیان، اجالے اور اندھکار کا یدھ تھا— لیکن بھائیوں سے ہی یدھ چھیڑتے سمے ارجن کے من میں جو شنکائیں (ڈر) اور موہ گھس گیا تھا وہی میرے من میں بھی ہے۔ پرنتو کیا کیا جاسکتا ہے''

ابھی کرنا یہ ہے، ڈاکٹر نویندو مسکرائے۔ہمیں اپنے اپنے گھر میں جا کر چین کی بنسی بجانی ہے۔میری گاڑی باہر ہے۔جو چلنا چاہیں انہیں چھوڑ آتا ہوں۔

چلیئے—

نلکانی بوجھل ہو کر بولے—

جب وہ لوگ باہر آئے، شہر کی سڑکیں سناٹے میں ڈوب چکی تھیں—

اور پولیس گاڑیوں کے سائرن چاروں طرف چیختے چل رہے تھے—

●●

چودھری برکت حسین کے لیے اس صدمے کی نوعیت عجیب تھی۔وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے منا کی موت کا ماتم کریں یا خوشی منائیں کہ چلو ایک بلا ٹلی۔جو افواہیں گشت کرتی ہوئی ان تک پہنچ رہی تھیں، ان کے حساب سے منا کسی مجرم سے کم نہیں تھا۔ایک ایسا مجرم، جس کے مرجانے میں ہی بھلائی تھی۔مگر باپ کا دل، ناتواں کندھے—ناتواں کندھوں پر اپنے جوان بچے کی لاش— شمیم اور جمیلہ پر یہ خبر دکھ کے پہاڑ کی طرح ٹوٹی تھی۔ شمیم پر تو غشی طاری تھی۔اس کے مائیکے کے لوگ بھی آ گئے تھے—

برکت حسین کا دل بیٹھ گیا۔آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا—پولیس کسٹڈی سے ہو کر لاش جب گھر لائی گئی تو منظر ہی دوسرا تھا—زیادہ تر بھاجپا کے کاریہ کرتا تھے۔جو انہیں سانتونا اور تسلی دے رہے تھے مگر اندر تک غم میں ڈوبے برکت حسین سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ وہ ان تسلیوں کا جواب کس طرح سے دیں—ان لوگوں نے یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ منا کے قتل کے پیچھے کسی پاکھنڈی ملا کا ہاتھ ہے اور وہ ضرور پکڑا جائے گا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ منا کا بدلہ لیے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

بہت دیر سے چپ برکت حسین کی آواز بھر گئی۔

''لوگو! اب مجھ سے کیا چاہتے ہو— مجھے جو کھونا تھا وہ تو میں نے کھو دیا— اپنا یقین، اپنی وفاداری اور اپنا بیٹا...... یہ محلے والے بھی مجھے ہی گناہ گار سمجھتے ہیں...... دیکھو، کوئی نہیں آیا...... کوئی نہیں آیا—''

وہ زار و قطار رو رہے تھے...... ماحول میں سناٹا پسرا تھا۔ یہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ جوان کے آنسوؤں کو پونچھ سکتا—

●●

نریندر نیل کنٹھ کو کنارے لے جا کر بولا۔

''یہ کیسی پرتکچھا ہے دوست؟''

نیل کنٹھ نے نظریں نیچی کر لیں—

نریندر نے اپنا پرشن دوبارہ دہرایا......

''یہ کیسی راجنیتی ہے—؟''

نیل کنٹھ نے دھیرے سے آنکھیں اٹھائیں—

نریندر نے پھر پوچھا۔ ستیہ مارگ کیا ہے؟

دھرم کیا ہے؟

کرم کیا ہے؟

نیل کنٹھ نے سگریٹ سلگا لیا— شاسک کو یہ شوبھا نہیں دیتا کہ وہ اس طرح کا کوئی پرشن پوچھے۔ راجیہ نرمان کے لیے جو اچت بنے، وہ اسے کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کے لیے مارگ کی بادھاؤں کو ہٹانا ہوتا ہے—

نریندر نے چونک کر نیل کنٹھ کی طرف دیکھا— آج تم نلکانی کی بھاشا میں بات کر رہے ہو— شاید یہ اس سمے کا ستیہ ہے اور تمہارے لئے اُچت، راجہ اپنے راج کو بچانے کے لیے یدھ چھیڑتا ہے اور یدھ میں مارا کون جاتا ہے۔ راجیہ کی جنتا، راجہ کے سپاہی، راج کے سپاہ سالار— ایک بات یاد رکھو، ہم راجہ نہیں ہیں— سپاہ سالار بھی نہیں۔ ہم جنتا ہیں اتھوا مورچہ پر شہید ہونے والے سپاہی۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

نیل کنٹھ نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ 'تمہارے بھیتر یہ دربلتا کیسے آ گئی۔'

''پتہ نہیں— شاید اس لیے— میری بھی پتنی ہے۔ بچے ہیں، پریوار ہے—''

اندر سے شمو کے چیخ چیخ کر رونے کی آواز آ رہی تھی...... نریندر کی آواز تھرتھرا گئی۔ نیل کنٹھ نے شنکا (شک) سے پوچھا—

''تم لوٹنا چاہتے ہو کیا—''

''نہیں مجھے۔ بس ڈر لگ رہا ہے—''

نیل کنٹھ پھر کچھ نہیں بولا۔ چپ ہو گیا—

(۳)

کہانی ختم ہو گئی، اب تھوڑے بہت واقعات بچے ہیں، جنہیں آپ تک پہنچانا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں— منا کو جس آدمی نے مارا، کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس آدمی کے بارے میں بھی آپ کو جانکاری دی جائے، مگر جناب وہ آدمی ہے ہی ایسا، کہ میرا دل چاہ رہا ہے، مختصر میں اس کے بارے میں بھی بتاتا چلوں۔

اسکا کیا نام ہے۔اسکو بھی نہیں پتہ— لیکن وہ چھولا مداری کے نام سے کبھی جانا جاتا تھا—چھولا مداری— کہاں پیدا ہوا، ملک کون ہے ؟ وطن کون سا ہے۔وہ ان سب سے انجانا ہے۔ پیدا ہوا تو ایک مداری دکھانے والے کے ساتھ ساتھ تھا۔ مداری کہتا۔ بول چھورے۔ تیرا دھرم کیا ہے۔

وہ کہتا پیسہ دھرم ہے—

وہ پوچھتا تیرا کرم کیا ہے—

چھولا بولتا۔سرکار مائی باپ پیسہ ہی کرم ہے—

تماشہ دکھاتے دکھاتے وہ سرکس میں بھرتی ہوا۔ پھر وہاں سے نکل کر ہاتھ کی صفائی دکھاتا رہا— وقت کے ساتھ مداری اور چھولا کے تماشے میں لوگوں کی دلچسپیاں ختم ہوگئی تھیں— پھر چھولا نے پیسوں کے لئے افیم اور چرس بیچنا شروع کر دیا۔ منا کی ہتیا کی بات آئی تو چھولا اچھے پیسوں کے عوض فوراً ہی رام ہوگیا۔ سر پر ٹوپی چڑھا کر اور لنگی پہن کر وہ سچ مچ ملاّ بن گیا— ملاّ پکڑا بھی گیا اور چھوٹ بھی گیا۔ اب کیسے چھوٹ گیا اُسے جانے ہی دیجئے۔ جیسے بڑے بڑے ہتیارے اور اپرادھی چھوٹ جاتے ہیں— اور آرام سے سینہ تانے معزز شہریوں کی طرح کار، ایئر کنڈیشن گاڑیوں میں میں گھومتے رہتے ہیں۔ ملاّ چھولا بھی چھوٹ گیا اور پھر اپنے دھندھے میں لگ گیا۔

●●

منا کی موت کے بعد شہر کی فضا کچھ زیادہ ہی خراب ہوگئی— بکھرے ہوئے لوگوں پر قابو پانا اس بار پولس کے لئے آسان ثابت نہیں ہوا۔ اور جیسا، اس طرح کے دنگوں کے بارے میں، افواہ بطور کہا جاتا ہے کہ اس میں پولیس کی بھومیکا بھی رہتی ہے۔ کئی دکانیں نذر آتش کر دی گئیں — مکانوں میں آگ لگا دی گئی— سڑک پر سے کھینچ کھینچ کر لوگوں کو مارا گیا— پورے چار دن تک آگ اور خون کی بارش اس شہر میں ہوتی رہی — گو بالمکند شرما جوش کا مکان اِن خطروں سے باہر تھا— مگر دہشت تھی، یا کیا تھا، ایک صبح وہ اپنے بستر پر مردہ پائے گئے—

مردہ پائی جانے والی صبح سے پہلے کی کہانی لوگ اس طرح بیان کرتے ہیں— رات اپنے دامن میں قیامت خیز سناٹا لیکر آئی تھی۔ منا کی موت کی خبر سننے کے بعد وہ جیسے ادھ مرے ہو گئے تھے۔ خبر لانے والے کو بری طرح سے ڈانٹ دیا۔ مر گیا یا قتل کر دیا گیا تو میں کیا کروں۔ یہاں زندہ کون ہے— پھر بستر پر اکڑوں، بیٹھ گئے— چپ— بچوں نے کھانے کے لئے پوچھا تو سیدھا انکار کر دیا— اوما کھانا لیکر آئی تو پلیٹ پھینک دیا۔ کسی سے بات چیت نہیں — مرنے کے روز تک وہ گم سم رہے۔ ہاں انہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا، جیسے انکے اندر کوئی ذہنی کشمکش چل رہی ہو— نریندر اور انیل باؤجی کے پاس آکر اداس سے بیٹھ جاتے مگر وہ نظر تک اٹھا کر ان کی طرف نہ دیکھتے۔ کھانے کے نام پر ان کے تیور بدل جاتے اور شہر میں پھیلا ہوا لہو جیسے ان کے آنکھوں میں سمٹ آتا— جس رات وہ مردہ پائے گئے، اس رات— شہر میں فساد تھما نہیں تھا۔

بالمکند بستر سے اٹھ کر بالکنی پر آ گئے— دکانیں بند— سڑک پر لوٹتا ہوا سناٹا۔ اور آس پاس سے اٹھتا ہوا دھواں۔ اندھیرے کمرے میں دور تک دھویں کی چادر بچھی ہوئی تھی— چیخنے اور چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں—

’اُس رات پڑوس میں جم کر دو فرقوں کے درمیان تصادم ہوا— دکانیں لوٹی اور جلائی گئیں— بالمکند گھبرا گھبرا کر بالکنی پر بھاگتے۔ پھر کمرے آ جاتے—

رات کے بارہ بجے ہونگے کہ وہ تیز تیز آواز چیخے……

’’ارے کوئی ہے……کوئی ہے۔،،

نریندر بھاگا بھاگا آیا تو انکی آنکھوں سے چنگاریاں ابل رہی تھیں۔

’’قلم کس نے چرالیا؟‘‘

’’قلم کون چرائے گا باؤجی۔ آپ نے ہی کہیں اِدھر اُدھر رکھ دیا ہوگا۔‘‘

وہ بپھر گئے۔ کون چرائے گا۔ تم لوگ چراؤ گے میاں۔ اور کون چرائے گا۔ لاؤ مجھے کچھ لکھنا ہے—

نریندر نے دبی زبان میں کچھ کہنا چاہا۔آپ بیمار ہیں۔آپ کی صحت اچھی نہیں بالمکند غصّے میں پڑ گئے ——''صحت اچھی نہیں ہے۔اس سے تمہیں مطلب میاں۔میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔تم لوگ کوئی سازش کر رہے ہو اس بڈھے کے لئے۔لاؤ میرا قلم۔مجھے کچھ لکھنا ہے——،،
''مگر کیا لکھنا ہے——،،
نریندر ملائمیت سے بولا مگر بالمکند فائر ہو گئے —— لکھنا ہے تم ہمارے بیٹے نہیں ہو—— عاق کرتا ہوں میں تم دونوں کو—— پوچھتے ہو کیا لکھنا ہے۔ارے قلم لاؤ میاں—— مجھے بیان دینا ہے—— مجھے اپنا بیان لکھنا ہے——
نریندر نے اس کے بعد کوئی سوال نہیں کیا۔چپ چاپ گیا اور مالو کا قلم لا کر ان کے ہاتھوں میں تھما دیا—— بیچ بیچ میں دبے پاؤ آ کر باؤ جی کا جائزہ لیتا رہا۔وہ کرسی پر بیٹھے، میز پر کاغذ قلم لئے کچھ لکھ رہے تھے—— بہت غصے اور تناؤ میں تھے۔لکھتے تھے اور پھاڑ کر ڈسٹ بن میں ڈال دیتے تھے—— باہر دنگوں کا شور اب بھی صاف صاف سنائی دے رہا تھا اور ایک بوڑھا اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا، پتہ نہیں کیسے بیان تحریری شکل دینے میں لگا تھا——
دوسرے دن اوما باؤ جی کو جگانے آئی تو وہ مرے پڑے تھے۔ڈسٹ بن میں کاغذات کے ڈھیر پڑے تھے—— انیل اور نریندر سارے کاغذات چھان مارے۔شاید مرنے سے پہلے باؤ جی کو وصیت کا خیال آ گیا ہو——
مگر انھیں اب کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ہاں اردو کی چھوٹی سی چٹ تھی، جسے انیل نے چپکے سے اپنی جیب میں ڈال لیا——

●●

اس کے بعد کی کہانی کچھ بھی نہیں ہے جناب، سوائے اس کے، کہ ہم پانچوں انکی موت کے گواہ رہے ہیں......ہم پانچوں جنھیں وہ پیار سے پانچ پاپی کہتے تھے—— اور میں انہی پانچ پاپیوں میں سے ایک ہوں، جس نے بالمکند شرما جوش کی یہ کہانی آپ تک پہنچانے کی ذمہ داری قبول کی ہے—— میں ان پانچ پاپیوں میں سے کون ہوں، یہ زیادہ اہم نہیں—— ہاں ضروری یہ ہے کہ جس دن وہ مرے، ہم نے ان کے جنازے میں شرکت کی اور جو کچھ دیکھا اسے پورا پورا آپ تک پہنچانا اپنا فرض سمجھا—— جس دن وہ مرے' ان انتیشٹھی ممکن نہ ہو سکی۔شہر فساد اور کرفیو کی لپیٹ میں تھا —— شرما جی کی لاش برف کی سلیوں پر رکھ دی گئی تھی۔مرنے کے دوسرے دن کرفیو میں دو گھنٹے کی ڈھیل دی گئی—— اور اسی دو گھنٹے میں انکی انتیشٹھی کا فیصلہ لیا گیا—— گو کرفیو والے دن بھی ان کا انتم سنسکار ممکن نہ تھا کہ وہ کچھ دور دراز رشتے داروں کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں اور یہ دکھ بھری سوچنا ٹرنک کال کے ذریعہ ان تک پہنچا دی گئی ہے۔انتیشٹھی دوسرے دن تھی——

قصہ ختم

جوش صاحب کے مرنے بعد کی خبر دھیرے دھیرے شہر میں پھیل چکی تھی۔شہر کی حالت خراب ہونے کے باوجود ان کے یہاں آنے والوں کا تانتا سا بندھ گیا تھا—— ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں عرش پیامی، نذیر بنارسی اور دیگر ہم پیشہ قسم کے لوگ حاضر ہو چکے تھے۔سب کے چہرے پر غم کی بدلی چھائی ہوئی تھی۔
برآمدے میں کرسیاں نکلی ہوئی تھیں۔اندر کمرے سے ٹھہر ٹھہر کر رونے کی آواز اور سسکیوں کی آواز باہر آ جاتی—— ہمیں ایسا پہلی بار لگ رہا تھا کہ جوش صاحب محض ہمارے لئے ایک دلچسپ کردار نہیں تھے۔وہ کچھ اور بھی کہتے تھے۔ہمیں پتہ نہیں کیوں، یہ بھی لگ رہا تھا جوش صاحب کے مر جانے سے کچھ، پیدا ہوا ہے جسے ہم کبھی بھرا نہیں جانے والا خلا بھی کہہ سکتے ہیں۔لیکن کیسا خلا اس کے بارے میں ابھی ہم صاف نہیں تھے—— جوش صاحب اور انکی باتیں یاد آ رہی تھیں۔
ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ ان کے بڑے لڑکے انیل نے ہمیں کچھ اشارہ کیا—— اس سے پہلے ہمیں انیل نے کبھی منہ تک نہ لگایا تھا۔ہم چونکے ضرور تاہم انتظار کرتے رہے کہ وہ کیا ہے——
برا مت مانئے گا——، انیل ہمیں کنارے لے جا کر بولا۔آپ پتا جی کے ملنے والوں میں سے تھے۔اس لئے پوچھ رہا ہوں—— پتا جی کے

بارے میں آپ لوگوں کی کیا رائے تھی؟،
''رائے؟''
ہم ایک دم سے بھونچک ہوگئے۔ یہ مرحوم شرما جی کے بارے میں تاثر لینے کا کون سا وقت ہے —
حبیب کے چہرے پر ناراضگی پیدا ہوئی۔ وہ بولا اس کا مطلب — 'دراصل وہ آخری وقت میں خبطی ہوگئے تھے۔ ہمیں تو کچھ سمجھتے بھی نہیں تھے۔ سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے تھے۔ مرنے سے، ایک ماہ پہلے سے وہ ایک بات بار بار کہتے تھے کہ...... وہ کوئی بیان دینا چاہتے ہیں —' انیل نے ہماری طرف دیکھا — ہمیں آشچریہ ہے — شاید آپ کو اس بارے میں کچھ پتہ ہو —
'ہاں ہمیں بلایا تو تھا —' باقر مرزا کہتے کہتے رک گیا —
حبیب تنویر نے کہنی ماری — لیکن وہ کچھ بتا سکنے کے قابل نہیں تھے...... ان کی طبیعت کچھ خراب سی تھی — پتہ نہیں۔ ہوسکتا ہے ہمیں بھی کچھ کہنے کے لئے ہی بلایا ہو مگر —'
'ہم اور نریندر سمجھتے تھے کہ شاید گھر اور جائیداد کو لیکر وصیت کے بارے میں کچھ باتیں کریں گے۔ ہم خوش بھی ہوئے تھے — لیکن ہم نے وصیت کی بات چھیڑی تو ہمیں بری طرح جھڑک دیا۔ کمرے میں ٹہلتے رہے۔ یہ تھی انکی پر تکریا — بار بار ہم سے چیخ کر کہتے۔ بدتہذیبو! ناسپوتو تم لوگوں نے جنازہ نکال دیا۔ میری نسل ختم کردی۔ نریندر کی پتنی بولی کہ باؤجی ایسا کیوں کہتے ہو۔ ہم بھی تو آپ ہی کے بچے ہیں تو بگڑ گئے۔ یہ ہمارے بچے ہیں کہاں یہ تو — اب بتائیے۔ بہوؤں کے سامنے ایسا بولنا کیا شوبھا دیتا ہے —' انیل نے باری باری سے ہماری آنکھوں میں جھانکا۔ تو آپ کو وشواس ہے۔ انھوں نے بیان کے بارے میں آپ کو کچھ بھی نہیں بتایا۔ نہیں — ترقی پسند کے چہرے پر سلوٹیں پڑنے لگی تھیں۔
انیل نے کچھ سوچ کر گردن ہلائی — ہمارے باپ تھے وہ۔ باپ کے بارے کچھ غلط بات نہیں کہنی چاہئے — وہ بھی ایسے سمے جبکہ انکا انتم سنسکار بھی شیش ہے۔ لیکن سچ ہے۔ کبھی انھوں نے ہمیں سینے سے نہیں لگایا۔ ہم سے کبھی خوش نہیں دکھے — وہ گھر کو کتابوں اور شاعروں سے بھر دینا چاہتے تھے، اس نے زور دیا — جو ہم نہیں چاہتے تھے — وہ ایسا اور بھی بہت کچھ چاہتے تھے۔، اس نے زور دیا۔ جو ہم نہیں چاہتے تھے اور اسی لئے وہ ہم سے ناخوش رہتے تھے —
جاتے جاتے وہ بولا — ہاں ایک بات بتانا بھول گیا۔ ان کی بیڈ سے ایک چٹ برآمد ہوئی ہے۔ جس پر اردو میں کچھ لکھا تھا — شاید بے خبری میں کچھ لکھ رہے ہونگے۔ لیکن — اس نے جیبیں ٹٹولیں۔ یہاں نہیں ہے۔ شاید کہیں بھول گیا ہوں۔ پتا جی تو سنکی آدمی تھے۔ اور آخری وقت میں تو انھیں، اسکا چہرا سخت ہوگیا تھا۔ دونوں بھویں آپس میں مل گئی تھیں۔ آواز تھوڑی اونچی ہوئی۔ ڈاکٹر کا بھی یہی کہنا تھا۔ اور میرا بھی اب یہی ماننا ہے...... کہ وہ الزیمرس کے روگی ہوگئے تھے —'

●●

انیل کے جانے کے بعد باقر نے معصومیت سے کہا۔ کیا بڑھؤ سچ مچ خبطا گئے تھے؟
ترقی پسند نے کہا ہمیں وہ چٹ دیکھنی چاہئے۔ آخر کیا لکھا ہے —
یہ طے ہوا کہ ابھی سب مصروف ہیں لیکن بعد میں وہ انیل سے مل کر وہ چٹ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس کے بعد ہم اندر کمرے میں آگئے۔ برف کی سلیوں پر جوش صاحب کا جسم ٹھنڈا پڑا تھا۔ ہمیں یہ سوچ کر دھکا لگا کہ موت کے بعد انسان کی کیا حالت ہوجاتی ہے یہ وہی بڑھؤ ہیں، ہم جنھیں چھیڑتے تھے، مذاق اڑاتے تھے — لیکن زندگی کے بعد کا ایک سچ یہ بھی ہے — موت — سلیقہ، رکھ رکھاؤ نفاست، سب کو تج کر مردہ بے جان برف کی سلیوں پر رکھ دیا گیا تھا —
اندر، پردے سے ٹھہر ٹھہر کر عورتوں کے رونے کی آواز گونج اٹھتی — الزیمرس —
ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہیں۔ تو کیا حقیقت یہ تھی کہ جوش صاحب آخری وقت میں سب کچھ بھول چکے تھے — 'شاید ہمیں بھی —' احمد ربانی بولا — دیکھتے نہیں تھے، وہ ہمیں دیکھ کر کیسا کیسا کرنے لگتے تھے —

'نہیں۔ میں ماننے کو قطعی تیار نہیں ہوں، حبیب تنویر کو غصہ تھا۔ ماننے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے ان کے لڑکے بھی یہی کہہ رہے ہیں — وہ باتھ روم کی جگہ لٹرین اور لٹرین کی جگہ......'

ہم دھیرے سے ہنسے، پھر چپ ہو گئے، کچھ لوگ ہمیں گھور رہے تھے —

●●

اندر سے رونے کی آواز بدستور جاری تھی۔ کچھ لوگ دری اور چادریں بچھا رہے تھے۔

ہم نے دیکھا انیل ایک ادھیڑ عمر والے آدمی کے ساتھ ہمیں کھوجتا ہوا ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ ہمارے پاس آ کر وہ ٹھٹھک گیا۔

ان سے ملئے۔ یہ ہمارے دور کے رشتے کے چاچا ہیں۔ ان سے پوچھئے۔ یہ بھی یہی کہتے ہیں — کہ بابو جی مرنے سے پہلے —

'سیدھے کیوں نہیں کہتے — ' موٹے آدمی نے ہماری عمر کا اندازہ لگاتے ہوئے سختی سے ہمیں گھورا — وہ بیان نہیں، کچھ غلط بات کہنا چاہتے تھے۔ دراصل — وہ اٹکتے ہوئے بولے — آخری وقت میں دماغ چل گیا تھا اور ایسے لوگوں کا دماغ تو چل ہی جاتا ہے۔ یہ ہوتا ہے دھرم پر نہ چلنے کا پھل — دھرم سے بغاوت کا نتیجہ —

اس کے موٹے گال کچھ اور ہی پھول گئے۔ اس نے ہمارے چہرے کو رکھائی سے دیکھا۔ پھر کہا — اچھا — پھر ملتے ہیں۔ پھر باتیں کریں گے۔ ابھی آپ دیکھ رہے ہیں نا...... میں دمے کا روگی ہوں۔'

ہم نے دیکھا واقعی وہ تیز تیز ہانپ رہا تھا —

●●

آنسو اور شور وغل کے بیچ ارتھی اٹھی۔ اسی موٹے بوڑھے آدمی نے ہمیں اشارہ کیا — واپسی میں آپ لوگوں سے ملاقات رہے گی۔ اُس نے ہماری آنکھوں میں جھانکا — بڑھؤ نے جو کہا تھا ہمیں یاد ہے۔ آپ کو بتاؤنگا۔ ایک نامکمل آدمی کا بیان — ضروری ہے!'

اس نے دو تین بار ضروری ہے، ضروری ہے...... دہرایا۔ پھر چپ ہو گیا۔ ستیہ بولو ستیہ ہے۔ رام نام ستیہ ہے، کے بیچ ہم چپ چاپ چلتے رہے — راستے میں کئی بار لگا، وہ ہمیں دیکھ کر ٹھٹھکا ہو، کچھ بتاتے بتاتے رک گیا ہو — پھر چلنے لگا تھا۔

●●

کبھی کبھی کچھ نہیں ہوتا، لیکن احساس ہوتا ہے، کوئی بہت بڑا واقعہ گھٹ چکا ہے۔ بالمکند شرما جوش کے انتم سنسکار کے بعد ہم لوٹے تو محسوس ہوا، کہ ایسا کچھ ہو گیا ہے۔ ماحول میں ایک عجیب سا خالی پن آیا ہوا محسوس ہوا۔ موٹا آدمی دوبارہ ہمارا ہاتھ پکڑے گھر تک لے آیا تھا — رونے سسکنے کی آواز اب بند تھی۔ ہاں ایک بوجھل پن سا تھا جو عموماً ایسے ماحول میں پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن شاید یہ احساس ہمیں ہی تھا — دو ایک بار نریندر اپنی بچی کا ہاتھ پکڑے باہر آیا پھر لوٹ گیا۔ ہمیں لگ رہا تھا جیسے سب بہت جلد اپنے معمول پر لوٹ آئے ہوں — جیسے بوڑھؤ کی موجودگی کی وجہ سے اس گھر کے معمول یا آزادی پر فرق پڑا تھا۔ جیسے یہ بوڑھے کی نہ موجودگی نے سب کو یکدم سے آزاد کر دیا ہو —

موٹے نے گلہ کھکھارا۔ اس پر اب بھی دمے کا اثر تھا — وہ ہانپ رہا تھا۔ وہ ہانپتے ہوئے مسکرایا — ایک چیز ہوتی ہے کراس بریڈنگ — ہمارے شرما جی کا خیال تھا کہ ہمارے اس ساجھا کلچر کے کراس بریڈنگ سے بھارتیتا کا جنم ہوا تھا۔ اور اب جبکہ — اُس نے زور دیا — جبکہ یہ کراس بریڈنگ بند ہو گئی ہے تب سے صرف سامپردائیکتا (فرقہ واریت) جنم لے رہی ہے۔''

وہ ہنسا — الزیمرس۔ میں نہیں مانتا۔ مجھے لگتا ہے۔ وصیت سے بچنے کے لئے بڈھا ناٹک کھیل رہا تھا۔ لیکن کیوں۔ اس کا اُتر ہے۔ وہ اپنے لڑکوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اور انھیں اپنی زندگی کے بعد بھی لڑتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ ہاں۔ اور کیا کارن ہو سکتا ہے......'

'لیکن وہ بیان؟' ہم نے یاد دلایا —

موٹے نے کچھ سوچتے ہوئے ہماری طرف دیکھا — بیان کیا۔ بڈھا خبطی تھا۔ مجھے یاد ہے انتم ملاقات سے پہلے بار بار زور دیکر یہی کہتا تھا۔ اسکی مرتیو سادھارن گھٹنا نہیں ہے۔ اور شریف آدمیو!'

'اس نے ہماری طرف دیکھا۔اور آپ سچ جان سکتے ہیں کہ ایک بےضرر سا آدمی، خبطی معمولی آدمی، بے حد معمولی، اس نے زور دیا۔اسکی مرتیو کس طرح ایک آسادھارن (غیر معمولی) گھٹنا ہوسکتی ہے۔بس یہی کہتا تھا وہ بار بار۔

موٹا پھر زور زور سے ہانپ رہا تھا۔اس کا چہرہ لال سرخ ہوگیا تھا— آنکھیں چڑھ گئی تھیں۔ہانپتے ہانپتے منہ سے تھوڑا سا پھین باہر آ گیا جسے جیب سے رومال نکال کر اس نے فوراً صاف کرلیا پھر ہماری طرف دیکھا اور ہنسا—

اسکا بیان نامکمل رہا۔افسوس۔آپ کیا سوچتے ہیں۔ایک نامکمل زندگی، ایک نامکمل آدمی......ایک نامکمل بیان۔

اُس پر پھر ہنپنی، کا دورہ پڑ گیا تھا۔

••

کرفیو کے ختم ہوجانے کے بعد، ہم پانچوں دوبارہ مرحوم بالمکند شرما جوش کے گھر گئے— وہ چٹ اب تک ہمارے خیال میں بسی ہوئی تھی —اور چٹ کولیکر ایک عجیب سا تجسس بھی ہمارے اندر تھا کہ آخری وقت میں بڑھوؤ ذہن میں پتہ نہیں وہ کون بات آئی ہوگی، جسے لکھنا انھوں نے مناسب سمجھا ہوگا۔

ہم اپنی پرانی بیٹھک میں تھے—اور آنکھیں اٹھا اٹھا کر اس بدے ہوئے کمرے کو دیکھ رہے تھے—نہ کتابیں۔نہ جوش صاحب کی پرانی میز اور کرسی، کمرے کی چونا گردانی ہوئی تھی۔اور کمرہ جوش صاحب کی یادوں سے کٹا کٹا معلوم ہو رہا تھا۔

'معاف کیجئے گا۔دیر ہوگئی—

انیل کمرے میں آیا تو ہم جوش صاحب کی کتابوں اور مینو اسکرپٹ وغیرہ کے بارے میں پوچھا—انیل نے حیرت سے ہمیں دیکھا—وہ تو کل ہی کباڑی کے ہاتھوں بچوادیں۔آپ کی ضرورت کی تھیں تو آپ لے جاتے—باؤجی تو رہے نہیں۔اردو پڑھنا لکھنا ہم جانتے نہیں— آپ تو جانتے ہی ہیں—

ہمارے دل پر کیا گزری، ہم جانتے ہیں، لیکن ہم نے اس کا اظہار مناسب نہیں جانا—

'اور وہ چٹ......؟'

'دیکھئے نا، وہ چٹ بھی کہیں گم ہوگئی۔ویسے اب اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ کچھ لکھا ہوگا— خبطی آدمی تھے۔ہوسکتا ہے، وہ ہنسا۔آخری وقت میں شیر (شعر) لکھ رہے ہوں......'

لوٹتے وقت ہم نے اداس آنکھوں سے جوش صاحب کے مکان کو دیکھا—اس وقت پتہ نہیں کیا بات تھی، خود بہ خود ہم اتنے جذباتی ہوگئے کہ ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔اور جیسے ہم اپنی محبوباؤں کے ذکر پر، اپنی خیالی محبوباؤں کے ذکر پر، اپنی نظریں ایک دوسرے سے چرائے آنکھوں آنکھوں میں آنسو خشک کررہے تھے، جو جذبات کی رو میں بہنے اور پھسلنے پر آمادہ ہوگئے تھے—

ہم وہاں سے لوٹ پڑے۔لیکن ہمارے قدم اتنے بوجھل تھے جتنی نوکری نہ ملنے پر ناامیدی کی حالت میں ہوتے تھے، یا اس سے بھی زیادہ بوجھل— ہم ٹھیک بتا نہیں سکتے—

بیان

Friday, November 24, 2006

Bayaan: An Urdu novel on Hindu-Muslim relations during the turbulent period around Babri Masjid demolition

Musharraf Alam Zauqi's 'Bayaan' is the most important novel that captures the anxieties and fears of both Hindus and Muslims in the turbulent years from 1986 to1992--an era when the right wing BJP grew from strength to strength and ultimately the Ram Mandir movement led to the demolition of Babri Masjid.

I had heard so much about the novel but surprisingly I hadn't met anybody who had even read this novel. Agreed, Urdu has seen a decline in readership in India but it took me nearly a decade to get the book and when I held it, I had to finish it in one sitting.

The story revolves around elderly Balmukund Sharma 'Josh', a retired official and Urdu poet as his 'takhallus' suggests, his friend Barkat Husain and their families.

Balmukund Sharma believes in the culture which developed with the interaction of Hindus & Muslims in the country over centuries. He is an epitome of 'wazadari' and puts principles above everything.

One of his son, Narendera, a doctor, is fiercely anti-Muslim and is member of a right wing party (of course, BJP) while the other son is a trader and a small-time Congress worker. The sons don't understand their father's love for a language 'that is spoken by Muslims and the script which looks strange to them'.

They don't understand why their father goes to 'mushaira' and spends time with his Muslim friends and poets.
His friend Barkat Husain's son, Munna, is a clerk at the electricity office. He is tired of hearing the taunts of being a 'Pakistani at heart'.

The fathers helplessly watch their sons who turn even more communal than the generation that had seen the horrors of partition. The demolition of Babri Masjid comes as a big setback for Indian Muslims and causes irreparable damage to their psyche.

Munna gets restless and decides to join the anti-Muslim party. 'If we treat them as untouchable and

it comes to power, how will we deal with the situation, after all, we have to live and die here', he feels. He starts going to the party meetings and in turn becomes a pariah in his community. No body understands his dilemma, not even his father who could never understand his introvert son.

Meanwhile, Balmukund Sharma Josh has serious differences with his elder son. At a mushaira Josh is mocked at by some unemployed Muslim youths who tell him that his own son is a BJP-wala but Josh enjoys the best of both worlds, as an Urdu poet getting acclaim amongst Muslims.

Josh is sick of his sons who hate everything about him and his culture. Even his grand-daughter asks him, 'Are you Muslim dada-ji, but Muslims are bad'. He decides to deprive his communal sons of any share in the property.

Now his sons try every bit to please him. Meanwhile, his granddaughter gets ill and Munna and his wife gets the kid admitted in hospital and treated when Narendra was away to a party convention. Narendra's wife, a strict Brahmin who never ate at anybody's place discovers a postive side to Muslims and fights her husband. Munna is her brother now.

But Munna feels that he is a misfit in the right-wing party and begins to distance himself from the outfit that badly needed a few Muslim showboys. The local party leaders feel he might reveal their secrets. A man wearing a skull-cap (Muslim topi) is entrusted by a hard-core party leader to kill Munna and give the impression that Muslims killed the traitor of their community.

Shaken by the grief at the blood and gore, communal riots and the destruction of composite culture in India, Balmukund Sharma Josh is fast getting insane and decides to write a 'bayaan' [a statement, a will or a confession]. His sons are worried what is in store for them...what is going to be this bayaan?

It is undoubtely a magnum opus. It was the story of every Indian town in that era. The curfews, riots, clashes, angry rhetorics against muslims, the steady lumpenisation of the middle-class that was fuelled by politicians and Hindi newspapers in North India, which had threatened the entire social fabric of the country.

The novelist manages to capture it with perfection. Zauqi is a master story-teller and is not only the leading Urdu writer of his generation but also acclaimed Hindi writer, who is published in Hans and other prestigious literary magazines.

Lots of lessons from the novel. Surprisingly, there are so many major works about partition, Bayaan is the probably the only Urdu novel that focuses on the inter-religious relationships and the communalisation that affected both communities in this era.
Has this generation even lost its voice

A Letter to Zauqui

Abid Surti

My dear Zauqui,

Last night I completed your bookd 'Byan". First, let me tell you that 'Bayan" is one of the finest books of the decade. After years I have read an Urdu book that runs like juicy fiction. It is a rare achievement for work of literature in any language. The characters of Bal Mukund and Munna are unforgetatable. In fact they are so true to life that one can easily identify them. For example, in my friend Mr. Jagmohan Mattu here in Bombay, I can see your Bal Mukund alive and kicking (From tomorrow he is going to begin leading your book). Your style of writing reminds me of Henry Miller, the controversial authour of 'Tropic of Cancer' and 'Tropic of Capricom'. Your short, terse sentences sprinkled with a satirical humor penetrate deep into the reader's heart. Here are a few lines which felt inllustrated this point admirably.

1- og tho fdlh canwd dh xksyh dh rjg iSnk gksrs gh ftLe esa nkx nh tkrh FkhA

2- vka[kksa esa 'kk;n chrs bfrgkl ds dkaVs pqHk x;s gSA

3- rUgk dejk--- [kkeks'k dejk] dHkh&dHkh dejk cksyrk gS---

This entire paragraph was touching.

There is so much to say Iwish I was in Delhi and in front of you. By chance if you happen to visit Bombay do inform me. I wish you all the success, all the way.

ایک خط ذوقی کے نام

—ڈاکٹر محمد حسن

ذوقی:
کیسے لکھ پائے تم
اتنا دل دوز المیہ
بغیر خون کے آنسوؤں کے

سچ یہ ہے کہ ذوقی، تم نے ایک عظیم ناول لکھا ہے۔ بیان: اور خون جگر سے لکھا ہے ہر لفظ کثرت استعمال سے گونگا ہو جاتا ہے۔ میرے لفظوں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ اس ڈھڑکتے ہوئے ناول کی کیفیات کو بیان کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ صرف آنکھ میں تیرتے آنسو ہی اس کام کو انجام دے سکتے ہیں۔ اقبال نے داغ پر نظم لکھی تھی جس میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جس طرح سعدی۔ بغداد کی تباہی پر اور ابن بدروں قرطبہ کی بربادی پر فریادی ہوئے تھے اسی طرح جہان آباد کی تہذیب کا ماتم داغ کے نصیب میں تھے۔ تقسیم ہند اور اس سے پیدا شدہ تباہی پر بہت کچھ لکھا گیا مگر ۶ ر دسمبر کی تباہی اس سے مختلف بھی تھی اور اس سے کہیں زیادہ بھیانک بھی کہ اس نے ہمیشہ کے لیے بال مکند شرما جوش جیسے انسان نما فرشتوں شاعر۔'' پایا تھا آسماں نے جسے خاک چھان کر'' کیسی

عظیم تہذیب جس کی تعمیر میں صدیوں تک ہندو مسلمان سب شریک رہے اور اس کا کیسا عبرت ناک انجام......جس پر جان دینے کے لیے اکیلے بال مکند شرما جوش قتل ہونے کے لیے منا اور اس المیہ کو رقم کرنے والے تم......

اس زندہ المیہ کو ناول کی حیثیت سے دیکھنا یا اس پر کچھ لکھنا بھی ستم ہے...... یوں بھی ابھی ہم اس سے پوری طرح گزرے کہاں ہیں، گزر رہے ہیں۔ بقول فیض ؎

اماں کیسی کہ موج خوں ابھی سر سے نہیں گزری

گزر جائے تو شاید بازوے قاتل ٹھہر جائے

تمدن کی ہر ادا تہذیب کی ہر روش اس قتل عام کی زد میں ہے۔ محسوس سب کرتے ہیں لیکن لفظ سب کو نہیں ملتے کہ درد و داغ و جستجو آرزو کا یہ کارواں اور اس کا یہ سر بازار قتل برداشت ہو بھی جائے تو بیان نہیں ہوتا......(پھر کیا تعجب ہے کہ بال مکند شرما جوش کو بھی آخری بیان کے لیے لفظ نہ ملے ہوں) تم نے بڑی ہنر مندی سے اس آخری بیان کو سر بہ مہر ہی رکھا ہے......مگر اب اس کی امید بھی فضول ہے کہ کوئی آبلہ پا ہمارے بعد بھی ان منزلوں میں بھٹکنے کے لیے کبھی آئے گا۔

تمہارے اس ناول کو ناول کی طرح پڑھنے اور پرکھنے کے لیے ابھی کچھ اور وقت اور کچھ اور فاصلہ درکار ہے۔ ابھی تو ایک ایسا کاری زخم ہے جس سے رہ رہ کر خون ابلتا ہے، اسے میں احتجاج نہیں کہوں گا۔ اسے میں دور حاضر کی گواہی بھی نہیں کہوں گا۔ یہ ناول ان اصطلاحوں سے کہیں بڑا ہے اور ان دو متوازی واقعات کے سلسلے پر قایم ہے جو منا کے قتل اور بال مکند شرما جوش کی موت سے عبارت ہے...... بلکہ یوں کہوں ان دونوں کے ساتھ ایک عظیم تہذیب کے قتل سے عبارت ہے۔ تم نے اسے بڑے اہتمام اور احتیاط سے بیان کر دیا ہے۔ کیسے لکھ پائے تم ایسا دلدوز المیہ بغیر خون کے آنسوؤں کے......! تعجب ہے! یہی غیر حاضر بلکہ شاید غیر موجود 'بیان' ہی سب سے بڑی فرد جرم ہے، جو ایک عظیم تہذیب کے قاتلوں پر عائد ہوتی ہے......مگر سوال یہ ہے کہ سزا وہ دے جس کے ہاتھ خون سے پاک ہوں اور پہلا پتھر وہ مارے جس نے زندگی میں کبھی کوئی گناہ نہیں کیا ہو۔ بے گناہ اب بھی بہت ہی مگر وہ صرف قتل ہونے کے منتظر ہیں......ایک تمہارے ہاتھ میں قلم ہے اس کی عزت کرو جو ایسے دردمند لمحوں کی کہانی اس قدر دلدوزی اور دلدوز انداز میں لکھ سکے۔ یہ بال مکند شرما جوش ایک پوری تہذیب کا نام ہے جو غروب تو ہوتی ہے، مکمل طور پر کبھی مٹتی نہیں کہ انہیں سے تو انسانیت کی رمق زندہ رہتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ظالموں کے تذکرے اور ۶ دسمبر کی یادیں۔

اس ناول کا محاکمہ دیر طلب ہے جب تک وقت ان زخموں کو بھر نہیں دیتا یہ کام شاید ممکن نہ ہوگا۔